Regd. L. No.7243

Phone [illegible]

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

اکتوبر 1978

اس پرچہ میں :

اسلام میں اجتہاد کی اہمیت

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲ لاہور

قیمت فی پرچہ : 2 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلی فون نمبر	بدلِ اشتراک
۲ دو روپے	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی ۔ گلبرگ ۲ لاہور	سالانہ پاکستان ۔۔۔۔۔۔ -/۲۴ روپے غیر ممالک ۔۔۔۔ -/۳ پونڈ
شمارہ ۱۰	اکتوبر ۱۹۷۸ء	جلد ۳۱

فہرست

۱۔ لمعات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲

۲۔ ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۷

۳۔ روزوں کا مقصد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۹

(محترم پرویز صاحب کا خصوصی درس) ــــــــــ

۴۔ احتساب (قسط ۳) ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۷

۵۔ طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۸

۶۔ ہمارا پروگرام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۱

۷۔ اسلام میں اجتہاد کی اہمیت ۔۔۔۔۔۔۔۔ ۳۳

(محترم پرویز صاحب) ــــــــــ

۸۔ قرآنی قوانین ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۶۴

ایڈیٹر محمد خلیل ۔ ناشر سراج الحق ۔ مقامِ اشاعت ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور ۔ پرنٹر شیخ نیاز احمد ۔ مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۷ ہسپتال روڈ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

آجکل ملک میں بلوچستان کے مشہور سیاسی لیڈر، میر غوث بخش بزنجو کے بعض بیانات کا خاصا چرچا ہو رہا ہے اور وہ مختلف گوشوں میں بحث و نظر کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ یہ بیانات تو طویل طویل ہیں لیکن ان کا ملخص حسبِ ذیل ہے :-

۱- میر صاحب نے فرمایا کہ "اب میں اس الزام کی طرف آتا ہوں کہ میں نظریۂ پاکستان اور مسلم قومیت کے تصور کے خلاف ہوں۔ نظریۂ پاکستان اور مسلم قومیت کے ان خود ساختہ علمبرداروں کو میرا جواب یہ ہے کہ اس کرۂ ارض پر مسلم قومیت جیسی کسی شئے کا وجود نہیں ہے۔ اسی طرح نظریۂ پاکستان نام کی کوئی چیز نہ تو پہلے تھی اور نہ اب ہے۔ ظاہر ہے کہ مجھ پر کسی ایسی چیز کا الزام نہیں لگایا جا سکتا جس کا کوئی وجود ہی نہ ہو۔ (روزنامہ امن کراچی۔ مورخہ ۳۰ اگست ۱۹۷۸ء)

۲- پاکستان میں چار قومیتیں بستی ہیں۔ یعنی بلوچی، سندھی، پنجابی اور افغان۔ یہ چار قومیتیں اپنے اپنے مخصوص علاقوں میں بستی ہیں۔ ایک مسلم قومیت کی بجائے ان چار قومیتوں کے الگ الگ وجود کو تسلیم کیا جائے اور ایسا آئین مرتب کیا جائے جس کی رُو سے ان صوبوں کو کامل حقِ خود اختیاری حاصل ہو۔ اور مرکز کے پاس امورِ خارجہ، دفاع، مواصلات اور کرنسی کے محکمے رہیں۔

(نوائے وقت۔ مورخہ ۲۹ اگست ۱۹۷۸ء)

کوئی مملکت ہو، نظام ہو یا تنظیم، اس میں بعض امور کی حیثیت اساسی ہوتی ہے اور ان کا انکار درحقیقت اس مملکت، نظام یا تنظیم کا انکار ہوتا ہے۔ اسلام کے حوالے سے یوں سمجھئے کہ اس میں خدا کی وحدانیت اور نبئ اکرمؐ کی رسالت اور ختمِ نبوت اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو شخص ان کے وجود کا انکار کرے وہ ملّتِ اسلامیہ کا فرد نہیں رہ سکتا۔ اگر کسی مسلمان کی طرف سے اس قسم کا اعلان ہوتا ہے، تو اس کا ردِ عمل یہ نہیں ہونا چاہیئے کہ ہم ان مسلّمات کا وجود ثابت کرنے کے لئے بیانات جاری کریں، مضامین لکھیں اور خطابات شائع کریں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس شخص سے کہا جائے کہ ان حقائق پر ایمان لانے سے ایک شخص مسلمان قرار پاتا ہے۔ فرض تو یہی کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے ان حقائق کو تسلیم کرنے کے بعد ملّتِ اسلامیہ کا فرد بننے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ اگر ایسا نہیں، تو آپ اب اس کا فیصلہ کر لیں۔ اگر آپ ان مسلّمات کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے تو پھر آپ اس ملت کے فرد نہیں رہ سکتے۔ اس

کے بعد آپ جونسا مسلک چاہے اختیار کر سکتے ہیں۔

اس مثال کے بعد آپ بزنجو صاحب کے بیان کی طرف آیئے۔ مسلم قومیت سے مراد یہ ہے کہ اسلام میں قومیت کا معیار رنگ، نسل، زبان، روایات یا وطن کا اشتراک نہیں۔ اس کا معیار دین کا اشتراک ہے۔ اور نظریۂ پاکستان کا مفہوم یہ ہے کہ اس مملکت کا جملہ کاروبار قرآن مجید میں متعین کی گئی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائے۔ یہ دونوں نظریات اسلام کے مسلّمہ اساسی اصول ہیں، اور مملکتِ پاکستان کی عمارت انہی مسلّمات کی بنیاد پر استوار ہوئی ہے۔ اگر کوئی پاکستانی ان مسلّمات کے وجود سے انکار کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بالواسطہ خود مملکتِ پاکستان کے الگ وجود سے انکار کرتا ہے۔ اس قسم کے بیانات کا جواب، انفرادی طور پر بیانات' مقالات' یا خطابات نہیں۔ ان کا تعلق مملکت کی اصل بنیاد سے ہے۔ لہٰذا، یہ حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ خود اس کا نوٹس لے اور اس کے متعلق مناسب کارروائی کرے۔

لیکن یہاں مصیبت یہ ہے کہ گذشتہ تیس سال میں ان بنیادی مسلّمات کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ اہمیت دینا تو ایک طرف ان مسلّمات سے عملاً انحراف کیا گیا۔ پہلے مسلم قومیت کو لیجئے جسے دو قومی نظریہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایک خطۂ زمین میں بسنے والے مسلمان الگ قوم ہیں اور غیر مسلم ان سے الگ قوم۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد ہم نے عملاً اس سے انحراف کیا' اور پاکستان کی جغرافیائی حدود کے اندر بسنے والے مسلم اور غیر مسلم باشندوں کو ایک قوم تسلیم کر لیا اور اسے آئینی تحفظ بھی دے دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں ایک غیر مسلم بھی اسی طرح پاکستانی نیشنل (یعنی پاکستانی قوم کا فرد) ہے۔ جس طرح ایک مسلمان پاکستانی نیشنل ہے جب صورتِ حال یہ ہے تو کسی بزنجو یا مینگل (یا کسی اور صاحب) کا یہ کہنا کہ یہاں مسلم قومیت کا کوئی وجود نہیں قابلِ فہم ہے۔ ان کی غلطی یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اسلام نے مسلم قومیت کا نظریہ یا تصور پیش نہیں کیا۔ یہ ایک واضح حقیقت کا انکار ہے۔ ایمان کے اشتراک کی بناء پر مسلم قوم کی تشکیل اسلام کا بنیادی رکن ہے اور اس کا انکار اسلام کے بنیادی اصول کا انکار۔ طلوعِ اسلام تقسیمِ ہند کے پہلے دور میں بھی اس حقیقت کے متعلق بتکرار و اصرار لکھتا رہا اور تقسیمِ ہند کے بعد بھی مسلسل لکھتا چلا آرہا ہے۔ اس کا شاید ہی کوئی پرچہ ایسا ہو جس میں اس بنیادی نکتہ کے متعلق کچھ نہ کچھ کہا نہ گیا ہو۔ اس کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ (مثلاً) اقبالؒ اور دو قومی نظریہ۔ قائدِاعظمؒ اور دو قومی نظریہ۔ قائدِاعظمؒ اور قرآن مجید۔ اقبالؒ اور قرآن وغیرہ اس حقیقت کے شاہد ہیں۔

باقی رہا نظریۂ پاکستان۔ سو اس کے متعلق آج تک کسی نے نہیں بتایا کہ اس کا مفہوم کیا ہے؟ علامہ اقبالؒ اور قائدِاعظمؒ نے بڑی وضاحت سے بتایا کہ اس سے مراد ایسا نظام ہے جس میں جملہ کاروبارِ مملکت قرآن مجید کی حدود کے اندر رہتے ہوئے سرانجام پائیں۔ طلوعِ اسلام نے اس کے متعلق بھی اتنا کچھ لکھا ہے کہ اسے یکجا کیا جائے تو ضخیم مجلدات تیار ہو جائیں۔ لیکن اس کے متعلق بھی نہ کسی

حکومت نے آج تک کوئی وضاحت کی اور نہ ہی اسے عملاً اختیار کیا ہے۔

اب آیئے چار صوبوں میں بسنے والی "چار قومیتوں" اور ان صوبوں کی خود اختیاری کی طرف تقسیم ہند کے وقت یہ خطۂ زمین، جسے اب مغربی پاکستان کہہ کر پکارا جاتا ہے، چار صوبوں میں منقسم تھا۔ (بلوچستان کو صوبائی حیثیت تو حاصل نہیں تھی لیکن زیرِ نظر موضوع کے لحاظ سے ہم اسے بھی صوبہ ہی کہہ کر پکارتے ہیں)۔ انگریزوں نے یہ تقسیم انتظامی مصالح کی خاطر کی تھی۔ اگر ان کی یہ مصلحت کارفرما ہوتی تو یہ علاقہ بھی بنگال کی طرح ایک ہی صوبہ ہوتا۔ انگریزی عملداری کے شروع میں پنجاب اور سرحد ایک ہی صوبہ تھے۔ سن ۱۹۰۱ء میں انہیں الگ الگ صوبے بنا دیا گیا۔ سندھ کو انگریزوں نے ۱۸۴۳ء میں ہتھیایا اور بمبئی کے ساتھ ملا دیا۔ اس وقت پنجاب ابھی انگریزوں کی عملداری میں نہیں آیا تھا۔ اگر اس وقت پنجاب انگریزوں کے پاس ہوتا تو سندھ کو پنجاب کے ساتھ ملایا جاتا نہ کہ بمبئی کے ساتھ۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ صوبوں کی ان لکیروں کو نہ کوئی تقدس حاصل ہے اور نہ ہی کسی قسم کی ازلی سند۔ جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے یہ لکیریں انتظامی مصلحتوں کی خاطر کھینچی گئیں لیکن جس انداز سے یہ لکیریں کھینچی گئیں وہ اس امر کی بھی غماز ہیں کہ ان لکیروں سے مقصد ان کے درمیان نسلی تفرقہ کو برقرار رکھنا اور مستحکم کرنا تھا۔ بلوچستان، سندھ اور سرحد میں سے ہر ایک میں کم و بیش ایک ہی نسل کے باشندے بستے ہیں۔ صرف پنجاب ایک ایسا صوبہ ہے جس میں یہ کیفیت نہیں۔ یہاں مخلوط نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ انگریزی عملداری میں یہ نسلی امتیازات مستقل حیثیت اختیار کر گئے۔ ان کی حکومت کا مفاد اسی میں تھا۔

تحریکِ پاکستان کے دوران ان خطوں میں بسنے والے مسلمان نسلی اور صوبجاتی سطح سے بلند ہو کر ایک قوم کی حیثیت سے سامنے آئے اور اس طرح مسلم قومیت یا دو قومی نظریہ کا مظہر بن گئے۔ لیکن انہوں نے یہ شکل علیٰ وجہ البصیرت قلبی عقیدہ کے نتیجہ میں اختیار نہیں کی تھی۔ اس کی بنیاد قائداعظمؒ کی بلندئ کردار تھی۔ یوں سمجھئے کہ ان کی حیثیت بزرگِ خاندان یا جھاڑو کے بندھن کی سی تھی جس سے مختلف تنکے یکجا رہتے ہیں جصولِ پاکستان کے بعد ایک تو یہ بندھن ٹوٹ گیا اور دوسرے قوم کے سامنے بے حد و شمار مالِ غنیمت آ گیا جس کی لوٹ جھپٹ کے لئے مختلف عصبیتوں نے سر ابھارنا شروع کر دیا۔ ہم نے اس کا فوراً نوٹس لیا اور اربابِ حل و عقد کی خدمت میں عرض کیا کہ قوم کے منتشر افراد، یا صوبجاتی اور نسلی گروہ بندیوں میں بٹے ہوئے اہلِ پاکستان کو مسلم قومیت کے قالب میں ڈھالنے کے لئے ضروری ہے کہ قوم کی نئی نسل کی تعلیم قرآنی خطوط پہ کی جائے جس سے یہ حقیقت ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے کہ نسل و وطنیت کی بنیادوں پر قومیت کا تصور خلافِ اسلام ہے۔ اور اسلام کی رو سے قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک ہے۔ لیکن ہماری اس پکار پر نہ اس وقت کسی نے کان دھرا اور نہ اس کے بعد آج تک کسی نے اسے درخورِ توجہ سمجھا ہے۔ اس کے برعکس ان نوجوانوں کو مغربی تصورِ قومیت کی تعلیم دی جاتی رہی۔ آج کی پاکستانی قوم انہی نوجوانوں پر مشتمل ہے اور فضا منتظر تھی اور ان کے ہمنواؤں کے اس قسم کے نعروں کیلئے سازگار ہے۔

ہم نے نظامِ تعلیم کی تبدیلی پر زور دینے کے ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ ایسے اقدامات کئے جائیں جن سے صوبائی امتیازات رفتہ رفتہ ختم ہو جائیں۔ چنانچہ طلوعِ اسلام نے اپنے پہلے شمارہ میں جو جنوری فروری ۱۹۴۸ء کا مشترکہ نمبر تھا۔ لکھا کہ:-

ہم پاکستان اور ہندوستان کے مسلمانوں میں اس بُعد و فصل اور بیگانگی و مغائرت کا رونا رو رہے ہیں جس کا ہمیں مستقبل میں خدشہ نظر آتا ہے لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ خود پاکستان کے۔ ما لوں میں صوبائی تعصب اس قدر

شدید ہے کہ اس کا احساس ہر قلبِ دردآگیں کے لئے وجہِ ہزار اضطراب ہے۔ (صفحہ ۱۱۲)

بجائے اس کے کہ ایسی تدابیر اختیار کی جاتیں جن سے یہ لکیریں آہستہ آہستہ مٹ جاتیں، حکومت نے ایک ایسا خطرناک قدم اٹھایا جس سے اس تفرقہ کی گرہیں اور مضبوط ہو گئیں۔ یعنی انہوں نے فیصلہ کیا کہ ملازمتوں میں صوبائی نیابت ہو۔ یہ فیصلہ مملکتِ پاکستان کے ضعف اور آخر الامر تباہی کا پیش خیمہ تھا۔ ظاہر ہے کہ طلوعِ اسلام اس پر خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے اپنے ستمبر ۱۹۴۹ء کے شمارہ میں لکھا:-

> آپ نے غور فرمایا کہ صوبائی تقسیم کا وہ شجرِ ملعونہ جسے انگریز کی حکمتِ فرعونی کا ابلیسی کارنامہ کہا جاتا تھا کس طرح خود اپنے ہاتھوں اپنے صحنِ گلستاں میں پیوست کر دیا گیا اور اس کی آبیاری کیسے ذمہ دار ہاتھوں سے ہوئی .... یہ تو تھی مشرقی اور مغربی پاکستان کی تقسیم۔ اب آگے بڑھیئے۔ حال ہی میں حکومت کے شائع کردہ ایک منشور میں کہا گیا ہے کہ مغربی پاکستان کے حصے کی آسامیاں پنجاب، سرحد، سندھ، کراچی، بلوچستان اور قبائلی علاقہ میں الگ الگ تقسیم کی جائیں گی۔ یہ وہ تقسیم ہے جو انگریز کے ملعون عہد میں بھی کبھی نہ ہوئی تھی..... صوبوں کی لکیریں محض نظم و نسق کی خاطر کھینچی گئی تھیں نہ کہ ملک کے باشندوں میں تفریق پیدا کرنے کیلئے۔ اگر یہ لکیریں اس قسم کی تفریق کے خطوط بن رہی ہیں تو ان لکیروں کو جس قدر جلد مٹایا جا سکے اتنا ہی اچھا ہے۔ (صفحہ ۳)

ہم اپنی اس پکار کو برابر دہراتے رہے تا آنکہ بائیس نومبر ۱۹۵۴ء کی شام کو (اس وقت کے) وزیر اعظم نے کراچی کے براڈکاسٹنگ سٹیشن سے ایک تقریر نشر کی جس میں انہوں نے کہا:-

> آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے یکم نومبر کے براڈکاسٹ میں صوبائی تعصب کے خطرات کی طرف توجہ دلائی تھی.... مجھے یقین ہے کہ آپ سب صوبائیت کے خطرہ سے آگاہ ہوں گے...... پاکستان میں باہمی تفریق کی ایسی مصنوعی لکیریں کھنچی ہوئی ہیں کہ جن سے ہماری قومی وحدت قائم نہیں رہتی۔ ہمیں بلا استثناء سب کو یقین ہو چکا ہے جب تک ان مصنوعی حدود و بندیوں کو نہ توڑا جائے گا صوبائی تعصب کی لعنت دور نہیں ہوگی۔ اب یہ مطالبہ چاروں طرف سے اٹھ رہا ہے کہ صوبائیت کی یہ لعنت جو ملتِ واحدہ کی حیثیت سے ہمارے وجود ہی کو خطرہ میں ڈال رہی ہے اس کا استیصال ضروری ہے..... پاکستان کی آئیڈیالوجی ایک خدا۔ ایک رسولؐ اور ایک قرآن کی بنیادوں پہ استوار ہے۔ اور یہی وہ آئیڈیالوجی ہے جو تمام اہلِ پاکستان کو ایک ملت بنا سکتی ہے۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ:-

> کچھ عرصہ پہلے میں نے آپ سے کہا تھا کہ میرے نزدیک بہترین اندازِ حکومت تو وحدانی انداز تھا لیکن چونکہ تمام پاکستان کو ایک وحدت بنانا ممکن نہیں۔ اس لئے ہمیں کم از کم مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا دینا چاہیئے۔ مغربی پاکستان کی موجودہ صوبائی تفریق کیلئے کوئی وجہ جواز نہیں۔ گذشتہ سات سال میں اس مصنوعی تقسیم نے تشتت و انتشار کے سوا اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کیا..... ویسے بھی ہمارے لئے یہ مشکل ہے کہ ہم ایسے انداز کی حکومت کی مسرفانہ عیاشی کو برداشت کر سکیں جس میں چھ یا سات الگ الگ اسمبلیاں، الگ الگ وزارتیں، الگ الگ سیکرٹریٹ اور ضرورت سے کہیں زیادہ الگ الگ ساز و سامان ہوں۔ لہٰذا یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ پورے مغربی پاکستان کو ایک وحدت بنا دیا جائے۔

ہر چند یہ فیصلہ ہمارے لئے موجبِ اطمینان تھا لیکن ہم نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی دسمبر ۱۹۵۴ء کی اشاعت میں لکھا کہ:-

یہ قدم جو اب اٹھایا گیا ہے، ہر چند بڑا اہم اور قابلِ قدر ہے لیکن یہ بہرحال ایک تخریبی قدم ہے۔ یعنی اس سے صوبائی تفریق کی لعنت ختم ہو گئی۔ لیکن ملت کی وحدت اسی صورت میں قائم ہو گی جب اس کے بعد تعمیری قدم بھی اٹھایا جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب جو صوبائی تفریق کا سانپ مرا ہے تو اس کی لکیریں بھی باقی نہیں رہنی چاہئیں۔ مفاد پرست گروہ یقیناً اس قسم کے سوالات پیدا کریگا کہ اس نئی وحدت میں پرانے صوبائی تحفظات ضرور ہونے چاہئیں۔ اگر اس قسم کا کوئی مطالبہ بھی تسلیم کر لیا گیا تو یاد رکھیئے، جس مقصد کے لئے یہ قدم اٹھایا گیا ہے وہ کبھی حاصل نہیں ہو سکے گا۔ اس کے بعد پہلی ہر قدم ایسا اٹھانا چاہیئے جس سے اس فتنہ ماضی کی یاد تک بھی دلوں میں باقی نہ رہے۔ پٹھانی، پنجابی، سندھی، بلوچی، الگ الگ کلچر اور روایات کا خیال عہدِ جاہلیت کے تصوّرات کا نتیجہ ہیں۔ مسلمان کا ایک ہی کلچر ہوتا ہے اور ایک ہی روایات۔ اسلام اس کا کلچر ہے اور اسلامی روایات ہی اس کی روایات ہیں۔ لہٰذا اس خیال کے مطابق جداگانہ تحفظات کے کسی مطالبہ کو تسلیم نہیں کرنا چاہیئے۔ البتہ جو علاقے پسماندہ ہوں ان کی مدد کر کے انہیں دوسروں کے برابر لے آنا سب سے پہلا فریضہ ہے۔ اسی کا نام قرآن کی زبان میں "احسان" ہے یعنی جہاں کسی کی کسی کمی سے معاشرہ کے توازن میں فرق آجائے اس کمی کو پورا کر کے معاشرہ کے حسن کو برقرار کر دیا جائے۔ اس باب میں طلوعِ اسلام وقتاً فوقتاً اپنے مشورے پیش کرتا رہے گا۔

وحدتِ مغربی پاکستان (جسے ONE - UNIT کی اصطلاح سے پکارا جاتا تھا) وجود میں تو آگئی لیکن اس سے جو انتظامی ابہام پیدا ہوئے ان کی اصلاح کی طرف کسی نے توجہ نہ دی۔ چاہیئے یہ تھا کہ پس ماندہ علاقوں کی بہبود کے لئے خصوصی اقدامات کئے جاتے اور مختلف علاقوں کے مقامی حکّام کو زیادہ سے زیادہ وسیع اختیارات دے دیئے جاتے تاکہ عوام کو اپنے روزمرّہ کے معاملات کے تصفیہ اور مسائل کے حل کے لئے دور دراز سفر طے کر کے مرکزی دارالحکومت میں نہ آنا پڑتا۔ لیکن ایسا نہ کیا گیا۔ اس سے عوام کو جو مشکلات پیش آئیں ان سے ان کے دل میں ون یونٹ کے خلاف جذبات ابھرنے شروع ہو گئے۔ جوں جوں ان مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا ان کی مخالفت کے جذبات شدید سے شدید تر ہوتے گئے۔ صوبوں کے الگ الگ وجود کے ساتھ، سیاسی رہنماؤں اور ان کی پارٹیوں کے مفاد وابستہ تھے۔ ون یونٹ سے یہ مفادات ختم ہو گئے تو انہوں نے عوام میں اشتعال پیدا کرنا شروع کر دیا۔ ہمیں انتہائی صدمہ سے لکھنا پڑتا ہے کہ اس صورتِ حال کی اصلاح کے لئے کوئی قدم نہ اٹھایا گیا حتیٰ کہ جب ۱۹۶۸ء میں چار قومیتوں کا فتنہ جگایا گیا تو اسے فرو کرنے کیلئے کوئی بھی مؤثر قدم نہ اٹھایا گیا اور جنرل یحییٰ کے دور میں ون یونٹ کو ختم کر کے پھر سے صوبجاتی نظام قائم کر دیا گیا۔

یہ ہے صوبجاتی تفریق کے ماضی کی داستان۔ مسٹر بزنجو نے صوبجاتی خود اختیاری کی جو آواز بلند کی ہے ہم سمجھ نہیں سکے کہ اس کا موقع اور محل کونسا تھا۔ اس کا صحیح مقام ملک کی مجلسِ آئین (قوانین ساز) کا اجلاس ہے۔ کیونکہ اس سوال کا تعلق مملکت کے آئین سے ہے۔ شاید اس کا مقصد اس وقت تک اس کے حق میں فضا ہموار کرنا ہو۔ بہرحال ہمارے دل میں تو اس آواز نے شیخ مجیب (مرحوم) کی یاد تازہ کرا دی ہے۔ اس کے چھ نکات کے نتیجہ میں آدھا ملک ہاتھ سے گیا تھا۔ اب اس قسم کی آوازوں سے بقایا آدھے کی بھی خیر دکھائی نہیں دیتی۔

خدا ایں سخت جاں را یار بادا!

——— (۰) ———

ادارۂ طلوعِ اسلام کی
مطبوعات کی قیمتیں

نوٹ:- ان قیمتوں میں ڈاک اور پیکنگ کا خرچ شامل نہیں۔

نام کتاب	قیمت
مفہوم القرآن - (کھلے پارے)	
پارہ نمبر ۱	۵/- روپے
پارہ نمبر ۲ تا پارہ نمبر ۲۸	۳/- " (فی پارہ)
پارہ نمبر ۲۹	۴/- روپے
پارہ نمبر ۳۰	۵/- "
مکمل سیٹ - (کھلے پارے)	۹۵/- "
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ مجلد تین جلدوں میں)	۱۲۰/- " (فی جلد ۴۰/- روپے)
لغات القرآن (مکمل سیٹ مجلد چار جلدوں میں)	۱۲۰/- " (فی جلد ۳۰/- روپے)
تبویب القرآن (مکمل سیٹ)	۱۶۰/- روپے
مطالب الفرقان (جلد اوّل)	۴۰/- "
مطالب الفرقان (جلد دوم)	۵۰/- روپے
قرآنی قوانین (جدید ایڈیشن)	۲۰/- "
من و یزداں	۳۰/- "
ابلیس و آدم	۲۵/- "
جوئے نور	۲۵/- "
برقِ طور	۲۵/- "
شعلۂ مستور	۲۵/- "
جہانِ فردا	۲۵/- "
کتاب التقدیر	۳۰/- "
معراجِ انسانیت	۴۵/- "
شاہکارِ رسالت	۴۵/- "
اقبالؒ اور قرآن	۲۵/- "
انسان نے کیا سوچا؟	۲۵/- "
مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں	۱۲/- "
اسبابِ زوالِ اُمت	۴/- "
قائدِ اعظمؒ اور طلوعِ اسلام	۴/- "

نام کتاب	قیمت
ISLAM: A CHALLENGE TO RELIGION. (HARD BOUND)	۴۰/- روپے
ISLAM: A CHALLENGE TO RELIGION. (PAPER BACK)	۳۰/- "
سلسبیل	۱۵/- روپے
فردوسِ گم گشتہ	۱۵/- "
ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت (مجلد)	۱۵/- "
سلیم کے نام خطوط (مکمل سیٹ تین جلدیں)	۳۶/- "
طاہرہ کے نام خطوط	۶/- "
مقامِ حدیث	۱۰/- "
اسلامی معاشرت	۴/- "
قرآنی فیصلے (مکمل سیٹ تین جلدیں)	۳۰/- " (فی جلد ۱۰/- روپے)
جہاد	۴/- روپے
عربی خود سیکھئے	۱۰/- "
پاکستان کا معمارِ اوّل	۲/- "
فجرالاسلام (جلد اوّل)	۵/- "

نام کتاب	قیمت
فجرالاسلام (جلد دوم)	۵/- روپے
منزل بہ منزل	۸/- "
قتلِ مرتد	۲/- "
عالمگیر افسانے	۱/- روپیہ
پرنسپل آف لامیکنگ ان اسلام (انگریزی)	۴/- روپے
جمع القرآن	۴/- "
تاریخ الامت (مکمل سیٹ آٹھ جلدیں)	۳۲/- " (فی جلد ۴/- روپے)
تصنیفات :-	
ڈاکٹر عبدالودود صاحب :-	
PHENOMENA OF NATURE & QURAN. (HARD BOUND)	۵۰/- روپے
CONSPIRACIES AGAINST QURAN. (HARD BOUND)	۴۰/- "
FOOD & HYGIENE IN ISLAM. (PAPER BACK)	۸/- "

ملنے کے پتے

(۱) - ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵/بی ۔ گلبرگ ۲ لاہور

(۲) - مکتبۂ دین و دانش ۔ چوک اردو بازار لاہور

روزوں کا مقصد

پرویز صاحب کے ہفتہ واری درسِ قرآن مجید کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ درس مسلسل ہوتا ہے اور آجکل سورۃ النّمل زیرِ تدریس ہے۔ گذشتہ رمضان المبارک میں سامعین کی طرف سے تقاضا ہوا کہ ایک خصوصی درس میں روزوں کے متعلق قرآنی احکام سامنے لائے جائیں۔ چنانچہ یکم ستمبر (جمعۃ الوداع) کے درس کا یہی موضوع تھا۔ درس حسبِ معمول برجستہ دیا گیا لیکن اس کی اہمیت کے پیشِ نظر مناسب سمجھا گیا کہ اسے طلوعِ اسلام میں بھی شائع کیا جائے۔ چنانچہ ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے اسے ازسرِنو مرتب کیا گیا ہے، جو پیشِ خدمتِ قارئین ہے۔

(٠)

خصوصی درس

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ○

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ گرامی قدر! درسِ قرآن کے سلسلہ کے اعتبار سے آج سورۃ النّمل کی اگلی آیت سے سلسلۂ کلام شروع ہونا چاہیئے تھا لیکن احباب کے تقاضا کے پیشِ نظر آج کا درس روزہ کے موضوع کے لئے مختص کیا جا رہا ہے۔ میں اس درس میں روزوں کے مسائل کے متعلق بات نہیں کروں گا۔ یہ احکام سورۃ بقرہ کی تین چار آیات (۲/۱۸۳-۱۸۷) میں نہایت جامعیت سے بیان ہوئے ہیں، اس لئے ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے بجائے میں اس امر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآنِ کریم کی رو سے روزوں کا مقصد کیا ہے؟ ان کی غایت کیا ہے؟ یہ کیوں فرض قرار دیئے گئے ہیں؟

قرآنِ کریم کی ایک خصوصیت (بلکہ جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے اس کی انفرادیت) یہ بھی ہے کہ یہ جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا گیا ہے؟ اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مثلاً اس قسم کی آیات آپ کو کئی ایک مقامات پر ملیں گی۔ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ - (۴/۱۱۳) "اے رسول! اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے"۔

کتاب کے معنے احکام یا قوانین کے ہیں اور حکمت سے مراد، ان احکام و قوانین کی غرض و غایت۔ یہ دونوں منزل من اللہ ہیں۔ احکام کے سلسلے میں یہ انداز، عظیم حکمت بالغہ پر مبنی ہے۔ اگر کسی کو کوئی حکم دیا جائے لیکن اس کی غرض و غایت نہ بتائی جائے۔ یعنی اسے یہ نہ بتایا جائے کہ اسے وہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے۔ تو وہ اس کی تعمیل طوعاً و کرہاً کرے گا، بطیب خاطر نہیں کرے گا۔ مستبد حکومتیں اسی طرح احکام صادر اور نافذ کرتی ہیں۔ لوگ ان پر بامر مجبوری عمل پیرا ہوتے ہیں اور اسی لئے ان سے گریز کی راہیں تراشتے اور فرار کے طریقے سوچتے رہتے ہیں۔ اگر انہیں بتا دیا جائے کہ ان احکام کی اطاعت سے انہیں کیا حاصل ہوگا۔ اس میں خود ان کے کیا کیا فوائد مضمر ہیں۔ تو وہ ان پر دل و دماغ کی کامل رضامندی سے عمل پیرا ہوں گے اور ان سے منحرف ہونے کا خیال تک بھی دل میں نہ لائیں گے۔ کتاب کے ساتھ حکمت کی وضاحت کی پہلی مصلحت یہ ہے۔

دوسرے یہ کہ جب آپ کو بتا دیا جائے کہ اس حکم کی تعمیل کا نتیجہ یہ ہوگا تو آپ قدم قدم پر اس کا جائزہ لیتے جائیں گے کہ اس حکم کی صحیح معنوں میں تعمیل ہو رہی ہے یا نہیں۔ اگر اس حکم کی غایت نہ بتائی جائے تو آپ اس پر بلا سوچے سمجھے مکینکل طور پر عمل کرتے رہیں گے اور کبھی یہ نہیں دیکھ سکیں گے کہ اس حکم کی تعمیل صحیح طور پر ہو رہی ہے یا نہیں۔ اور اگر آپ نے اپنے ذہن میں فرض کر لیا کہ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا تو آپ بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے اور ہو سکتا ہے کہ آپ کی ساری محنت رائیگاں چلی جائے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر مریض کے لئے ایک دوائی تجویز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دوائی دینے کے بعد مریض کا ٹمپریچر لیتے جائیں۔ ہر گھنٹے کے بعد کم از کم ایک ڈگری بخار کم ہو جائے گا۔ آپ مریض کو دوا پلاتے ہیں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس کا ٹمپریچر لیتے ہیں۔ اگر بخار کم ہو رہا ہے تو آپ کو اطمینان ہوگا اور آپ علاج جاری رکھیں گے۔ لیکن اگر آپ دیکھیں کہ بخار کم نہیں ہو رہا تو آپ کو از سر نو جائزہ لینا ہوگا کہ یا مرض کی تشخیص صحیح نہیں ہوئی۔ یا دوائی ٹھیک نہیں ملی۔ اور یا اس کے استعمال میں آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق نتیجہ برآمد نہ ہو اور آپ بدستور دوائی دیتے چلے جائیں۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو اس کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں کوئی حکم دیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا نکلے گا۔ اگر اس کا وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تو آپ کو رک کر سوچنا ہوگا کہ اس حکم کی تعمیل میں آپ سے کیا غلطی ہو گئی ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ آپ کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ اس حکم کی غلط تعمیل کے نقصانات سے بھی آپ محفوظ رہیں گے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ۔ (2/183) "اے جماعت مومنین! تم پر صیام فرض قرار دیئے گئے ہیں۔" یہ "کتاب" یعنی حکم ہے۔ اس کی غایات کے متعلق کہا۔ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ (2/183) لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (2/185) اور وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ (2/185)
تتقون سے مراد یہ ہے کہ تم میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لئے پختگی پیدا ہو جائے اور تم غلط راہوں

پر چلنے کے نقصانات سے محفوظ ہو جاؤ۔ تشکرون سے مقصود یہ ہے کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کریں۔ میں ان دو غایات کے متعلق سردست تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ قرآن کریم نے جو غایت الغایات بتائی ہے اس پر مرکوز ہوں گا۔ اور وہ غایۃ الغایات یہ ہے کہ تم خدا کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے سے اس قابل ہو جاؤ گے کہ دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کر سکو۔ یہ ہے روزوں کے متعلق حکمِ خداوندی کا مقصود و منتہیٰ۔ یعنی خدا کی کبریائی قائم کرنے کے قابل ہو جانا۔ لِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ۔

سب سے پہلے لفظ کبریائی کو لیجئے اس کے معنی حکومت اور اقتدار کے ہیں۔ سورۂ یونس میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی حضرت ہارونؑ، فرعون کے پاس گئے اور اس تک خدا کا پیغام پہنچایا تو اہلِ فرعون نے کہا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو ہم اس کی غرض و غایت کو خوب پہچانتے ہیں۔ یعنی یہ کہ: تَكُونَ لَكُمَا الْكِبْرِيَاءُ فِي الْأَرْضِ۔ (۱۰/۷۸) "یعنی تمہارا مقصد یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت تمہاری قائم ہو جائے۔ اقتدار تمہارے ہاتھ میں آ جائے" اس سے لفظ "کبریائی" کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

---(٠)---

جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے اس میں خدا کا اقتدار اور اس کی حکمرانی براہِ راست قائم ہے۔ تمام کارگہِ کائنات اسی کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے اور اس میں کسی شے کو مجالِ انحراف نہیں، یارائے سرکشی نہیں۔ وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۴۵/۳۷) "کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کبریائی خدا کی ہے۔ وہ زبردست غلبہ کا مالک ہے۔ لیکن اس کا غلبہ مستبد حکمرانوں کا غلبہ نہیں۔ وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے" دوسری جگہ ہے: وَهُوَ الَّذِي فِي السَّمَاءِ إِلَٰهٌ وَفِي الْأَرْضِ إِلَٰهٌ۔ (۴۳/۸۴) "وہی آسمانوں میں بھی صاحبِ اقتدار ہے اور وہی ارض پر بھی صاحبِ اقتدار" (الٰہ کے معنی صاحبِ اقتدار کے ہیں)۔

خارجی کائنات میں تو خدا کا اقتدار از خود قائم ہے لیکن اس کی مشیّت کا پروگرام یہ ہے کہ..... انسانوں کی دنیا میں اس کی کبریائی خود انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو۔ اسی مقصد کے لئے رسول بھیجے جاتے تھے اور رسول کے بعد اس کی ذمہ داری اس کی اُمت پر عائد ہوتی تھی۔ چنانچہ جب نبی اکرمؐ کو منصبِ نبوت پر سرفراز فرمایا گیا تو آپ کو حکم دیا گیا کہ: يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ۔ "اے وہ کہ جس کی آمد سے خزاں دیدہ گلشنِ کائنات بہارِ نو کا مظہر بن جائے گا۔ (المدثر کے یہی معنی ہیں)۔ قُمْ فَأَنذِرْ۔ "اٹھ اور نوعِ انسان کو ان کے اپنے وضع کردہ نظام ہائے حیات کی تباہ کاریوں سے آگاہ کر دے"۔ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ۔ (۷۴/۱-۳) "اور ان نظاموں کی جگہ اس نظام کو قائم کر جس میں کبریائی صرف خدا کے لئے ہو" یہ تھا منصبِ رسالت۔

دوسرے مقام پر اسی حقیقت کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان کی تفصیل بڑی وسعت چاہتی ہے۔

لیکن میں ان میں سے صرف دو ٹکڑوں کو نمایاں طور پر سامنے لاؤں گا۔ وَلَمْ يَكُن لَّهُ شَرِيكٌ فِي الْمُلْكِ "حکومت صرف اسی کیلئے مختص ہے۔ اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا" اور اس سے آگے ہے۔ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيرًا۔ (۱۷/۱۱۱) "لہٰذا تم اس کی کبریائی قائم کرو" اسی اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو ایک جگہ، الْمُتَكَبِّرُ (۵۹/۲۳) کہا ہے۔ کہیں اَلْكَبِيرُ الْمُتَعَالِ۔ (۱۳/۹) اور کہیں: اَلْعَلِيُّ الْكَبِيرُ (۲۲/۶۲)۔ ہماری دنیا میں وہ اَلْعَلِيُّ الْكَبِيرُ۔ کیسے قرار پاتا ہے اس کی وضاحت اس نے یہ کہہ کر کر دی کہ: فَالْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ (۴۰/۱۲) تمہاری دنیا میں حکم صرف اس خدا کا چلنا چاہیئے جو ہر قسم کے غلبہ اور کبریائی کا مالک ہے۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نہ تو ہمارے سامنے آتا ہے۔ نہ وہ تختِ حکومت پر بیٹھتا ہے۔ نہ ہم اس کی آواز سنتے ہیں۔ تو ہمارے معاشرے میں اس کی حکومت کیسے قائم ہوگی؟ اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ ـــــ اس نے ہماری طرف اپنا ضابطۂ احکام بھیج دیا ہے۔ جو حکومت اس ضابطہ کے مطابق قائم ہوگی اُسے خدا کی حکومت سے تعبیر کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ۔ (۵/۴۴) "جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ان ہی کو کافر کہا جاتا ہے۔"

ــــــــــ (۰) ــــــــــ

لیکن خدا کی یہ کبریائی یونہی بیٹھے بٹھائے، وعظ و نصیحت یا تقاریر و خطابات سے قائم نہیں ہو جاتی۔ جب اس کا مقصد دنیا کے ہر نظام کو اُلٹ کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی کو متمکن کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر حکومت کی طرف سے اس کی مخالفت ہوگی اور ہر مفاد پرست گروہ اس کی مزاحمت کرے گا۔ ان مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے کے لئے میدانِ جنگ تک میں بھی جانا پڑے گا۔ چنانچہ قرآن کریم میں جماعتِ مومنین کی ان جنگوں کی غایت یہ بتائی گئی ہے۔ وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا۔ (۹/۴۰) "اس سے مقصد یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی نظام مغلوب ہو جائے اور خدا کا نظام جسے غالب ہونے کا حق حاصل ہے، عملاً مسلط ہو جائے۔" اس سے چند ہی آیات پہلے کہا گیا ہے: هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (۹/۳۳) "خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا تا کہ یہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آ جائے۔ خواہ یہ تبدیلی ان لوگوں پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے جو خالص حکومتِ خداوندی قائم نہیں کرنا چاہتے۔"

یہاں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس نے رسول کو اس مقصد کے لئے بھیجا۔ لیکن دیگر مقامات پر اس کی وضاحت کر دی کہ نظامِ خداوندی کا قیام تنہا رسول کے ہاتھوں سے عمل میں نہیں آئے گا۔ اس کے لئے جماعتِ مومنین کی معاونت و رفاقت بھی ضروری ہوگی۔ یعنی یہ فریضہ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللَّهِ

وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ (۴۸/۲۹) کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اَلْاَعْلٰی اپنے آپ کو کہا تھا۔ لیکن جس جماعتِ مومنین کے ہاتھوں اس کی کبریائی دنیا میں قائم ہوتی ہے۔ اس نے انہیں اَلْاَعْلَوْنَ کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ اس نے فرمایا: وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۳/۱۳۸) اگر تم مومن ہو اور مومن رہو گے تو دنیا میں تم ہی سب پر غالب رہو گے۔ تمہارا قائم کردہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آجائے گا۔ اس غلبہ و تسلط کے لئے قرآن کریم نے اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ کی شرط عائد کر دی ہے۔ "یعنی اگر تم مومن ہوتے تو"۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے قرآن نے خود یہ واضح کر دیا کہ جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ مومن نہیں کافر ہیں۔ لہٰذا مومن وہ ہیں جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں۔ اور اس کی محسوس نشانی یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر قوم پر غالب رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا۔ (۴/۱۴۱) "خدا کبھی ایسا نہیں ہونے دے گا کہ غیر خداوندی نظام کی حامل قوم کو جماعتِ مومنین پر غالب آنے دے۔ لہٰذا یہ متعین کرنا بالکل آسان ہو گیا کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟

یہاں ایک عظیم نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ خدا مومنین سے کہتا ہے کہ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ۔ لیکن مومن اس کی عطا کردہ اس سرفرازی کے جذبۂ تشکر کے احساس سے بے ساختہ اپنا سر زمین پر رکھ دیتا ہے اور انتہائی انکساری اور خاکساری کے عالم میں کہتا ہے کہ اَلْاَعْلٰی میں نہیں۔ سُبْحٰنَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی ——— اَلْاَعْلٰی کے شایانِ شان صرف تیری ذات ہے۔ یہ تو تیری عاجز نوازیاں ہیں جو ہمیں اَلْاَعْلَوْنَ، کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ علو مرتبت ہماری ذاتی نہیں، تیری عطا فرمودہ ہے۔ اگر ہمارا سر تیرے سامنے نہیں جھکتا تو یہ ساری کبریائی جو ہمیں حاصل ہوئی ہے فرعون کی فرعونیت ہے۔ مومن کی علو شان نہیں۔ اسی بناء پر قرآنِ کریم نے حق پر مبنی کبریائی اور باطل پر مبنی کبریائی میں فرق کر کے بتا دیا۔ جب کہا: سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ (۷/۱۴۶) جو لوگ الحق کے بغیر زمین میں غلبہ اور کبریائی حاصل کر لیتے ہیں، ہم اپنے قوانین کی رو سے انہیں اس مقام سے ہٹا دیں گے۔ اور ان کی جگہ وہ قوم لے لے گی جس کی کبریائی الحق پر مبنی ہو گی۔

———(۰)———

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ روزوں کی غرض و غایت اور مقصود و منتہیٰ کیا تھا؟ ان کا مقصد جماعتِ مومنین کو اس کے لئے تیار کرنا تھا کہ وہ دنیا میں خدا کی کبریائی متمکن کر سکیں۔ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ۔ صدرِ اول کی جماعتِ مومنین تیرہ برس تک مکہ کی زندگی گزارنے کے بعد مدینہ میں آئی تاکہ یہاں کی نسبتاً مساعد فضا میں نظامِ خداوندی کی بنیاد رکھ دی جائے۔ لیکن مخالفین نے انہیں یہاں

بھی چھین لینے بیٹھے دیا اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ یہ تھا وہ مقام جب پہلی بار (سنہ ۲ ھ میں) روزے فرض ہوئے اور ابھی سترہ دن کے روزے ہی رکھے گئے تھے کہ انہیں بدر کے میدان میں اُترنا پڑا اور وہاں ان روزہ داروں نے خدا کی کبریائی کی پہلی اینٹ رکھ دی ....

آپ نے غور فرمایا کہ روزوں کی غایت کیا تھی ؟ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ۔ خدا کے پروگرام کے مطابق ملک میں اس کی کبریائی قائم کرنا۔ اس زمانے میں مستقل فوج (STANDING ARMY) ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی۔ قرآن مجید نے تمام مؤمنین کو مجاہدین (فوج کے سپاہی) قرار دیا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جس طرح آج کل مستقل فوج سے الگ (RESERVISTS) ہوتے ہیں۔ وہ اپنا اپنا کاروبار کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں سال میں ایک آدھ ماہ کے لئے بلا لیا جاتا ہے تاکہ وہ فوجی ٹریننگ کی تجدید کر لیں اور بوقتِ ضرورت فوج کے ہمدوش میدانِ جنگ میں نبرد آزما ہوں۔ خدا کی کبریائی کا تمکن مؤمن مجاہدین کا فریضہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کا مہینہ انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانے کے لئے مختص کر دیا گیا تھا۔ حضور نبی اکرمؐ سے جب سوال کیا گیا کہ مؤمن کی زندگی کیا ہے ؟ تو فرمایا کہ جب جنگ ہو رہی ہو تو وہ میدانِ جنگ میں ہو اور جب جنگ نہ ہو رہی ہو تو وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مؤمن کی زندگی کا مقصود و منتہا دنیا میں خدا کی کبریائی کو متمکن کرنا ہے اور یہی مقصد روزوں کا بتایا گیا ہے۔ اس کے لئے رمضان کے مہینے کی تخصیص کیوں کی گئی، اسے خود خدا نے یہ کہہ کر واضح کر دیا کہ: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (۲/۱۸۵) رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نزولِ قرآن کی ابتدا ہوئی۔ قرآن کریم کو اللہ تعالےٰ نے نوعِ انسان کے لئے نعمتِ عظمیٰ قرار دیا ہے اور ان سے کہا ہے کہ تم ایسی عظیم متاع کے ملنے پر جشنِ مسرت مناؤ۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا ۔ هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۔ (۱۰/۵۸) "اے رسول! ان سے کہہ دو کہ تمہیں یہ متاعِ گراں بہا بلا مزد و معاوضہ مل گئی ہے۔ اس کے ملنے پر تم جشن مناؤ۔ تم جو کچھ بھی دنیا میں جمع کرو، یہ اس سے زیادہ گراں قدر ہے۔" لہٰذا جسے عید الفطر کہا جاتا ہے، وہ درحقیقت جشنِ نزولِ قرآن ہے۔ قرآن خدا کی کبریائی کا ضابطۂ ہدایت ہے اور رمضان کے مہینے کے روزے مجاہدین کو خدا کی کبریائی قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کا پروگرام۔ اس پروگرام کے بخیر و خوبی انجام پانے پر جشنِ مسرت بالکل فطری عمل ہے۔

یہ تھا دین میں روزوں کا مقصد۔ یعنی لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۔ تاکہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کی جائے۔ لیکن جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا تو قرآن کریم کے یہ الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن ان کی غرض و غایت بالکل بدل گئی۔ آپ قرآنِ کریم کا کوئی سا با ترجمہ نسخہ اٹھا کر دیکھیں۔ اس میں ان آیات کا ترجمہ ان الفاظ میں ملے گا "تاکہ تم خدا کی بڑائی بیان کرو"۔ یعنی دین میں ان الفاظ کا مفہوم، خدا کی کبریائی قائم کرنا تھا۔ مذہب میں ان کا مطلب خدا کی بڑائی بیان کرنا رہ گیا۔ کبریائی قائم کرنے اور بڑائی بیان کرنے میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ اس بڑائی بیان کرنے کے حکم کی اطاعت

کے متعلق کہا گیا کہ نمازِ عید میں جو چھ زائد تکبیریں کہی جاتی ہیں ان سے اس حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔ اذان۔ نماز اور عیدین کی تکبیریں اپنی اپنی جگہ بجا اور درست، لیکن یہ تکبیریں ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ، یا ایک واقعہ کا اعلان تھیں۔ یعنی اس واقعہ کا اعلان کہ یہاں خدا کی کبریائی قائم ہے۔ اس حقیقت کے وقوع پذیر ہوئے بغیر، اس قسم کے اعلانات صرف چند الفاظ کا اعادہ ہیں۔ حقیقت اور اس کی رسمی ادائیگی کا یہی وہ فرق تھا جس کے احساس سے اقبالؒ کے دردمند دل نے باصد آہ و فغاں کہا تھا کہ:۔

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — مُلّا کی اذاں اور، مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

یہ مجاہد کی اذان تھی جو دن میں متعدد بار چھت اور مینارہ پر کھڑے ہو کر، دنیا میں اعلان کرتی تھی کہ:۔

اَللّٰہُ اَکْبَرُ

کبریائی صرف خدا کے لئے مختص ہے۔ اس میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا۔ اور اس کے بعد وہ اعلان کرتا تھا کہ:۔

اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ

میرا یہ اعلان اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ اس اعلان میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں یا اعلان کرتا ہوں۔ کہا یہ گیا کہ میں اس حقیقت کی "شہادت دیتا ہوں"۔ شہادت اسی کی قابلِ قبول ہوتی ہے جسے اس بات کا ذاتی طور پر علم ہو۔ جو اس کا عینی شاہد ہو۔ اگر کوئی شخص عدالت میں جا کر یہ کہے کہ مجھے اس واقعہ کا ذاتی طور پر تو علم نہیں۔ میرا خیال یہ ہے۔ یا میں نے ایسا سُنا ہے تو اس کی شہادت کا قابلِ قبول ہونا تو درکنار، اسے درخورِ سماعت بھی نہیں سمجھا جاتا۔ لہٰذا۔۔۔۔ اشھد ان لا الٰہ اسی کا قابلِ قبول ہوگا جو یہ کہے کہ میں اس امر کا عینی شاہد ہوں کہ یہاں خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔ یہاں خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ یہاں حکمرانی صرف خدا کی ہے۔ جو اس حقیقت کا عینی شاہد نہیں اُسے اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کہنے کا حق حاصل نہیں۔ یہی وہ شہادت ہے جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ: شَھِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ۔ "خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔ "وَالْمَلٰٓئِکَۃُ" " اور ملائکہ جو اس کے اس اقتدار کو بروئے کار لانے کے لئے مامور ہیں وہ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں۔ انہیں بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ اس کی شہادت دیں کیونکہ وہ اس کے عینی شاہد ہیں۔ اس کے بعد ہے۔ "وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ" ان کے علاوہ وہ لوگ بھی اس کی شہادت دے سکتے ہیں جنہیں اس کا علم بھی حاصل ہے اور پھر وہ ایسا

نظام متشکل کئے ہوئے ہیں جس میں خدا کی میزانِ عدل قائم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ: لَآ اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۳/۱۸) "خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں اور اس کا اقتدار تنہا قوت پر نہیں، بلکہ قوت کے ساتھ حکمت پر مبنی ہے"۔

آپ نے غور فرمایا۔۔۔ قرآن کریم کی رو سے اللہ اکبر کہنے کا حق کسے حاصل ہے؟ رمضان کے روزے جماعتِ مومنین کو اس قابل بنا دینے کے لئے تھے کہ وہ ملک میں خدا کی کبریائی قائم کریں اور پھر ساری دنیا کے سامنے اس کی شہادت دے سکیں۔

یہ ہے عزیزانِ من، میری قرآنی بصیرت کے مطابق صیام کی غرض و غایت اور رمضان کا مقصود و منتہا۔

والسلام

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

---(o)---

(یہ ہوتا ہے انداز پرویز صاحب کے درسِ قرآن کا۔ یہ درس ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور میں (آجکل) ہر جمعہ کی صبح ۸½ بجے بالمشافہ ہوتا ہے، اور مختلف شہروں کی بزم ہائے طلوعِ اسلام کے زیرِ اہتمام "ٹیپ ریکارڈر" پر۔ انفرادی طور پر حسبِ فرمائش، ان درسوں کے ٹیپ (CASSETTS) بھی مہیا کئے جا سکتے ہیں۔ ناظم ادارہ طلوعِ اسلام)

شکریہ

جشنِ نزولِ قرآن (عید الفطر) کی تقریب پر احباب کی طرف سے مجھے بکثرت عید کارڈ موصول ہوئے۔ یہ کارڈ ایک معاشرتی رسم سی بن کر رہ گئے ہیں لیکن مجھے جو احباب اس طرح ہدیۂ تبریک بھیجتے ہیں ان کے ساتھ میرا رشتہ قرآنی فکر کی ہم آہنگی کا ہے اس لئے ان کی طرف سے یہ کارڈ رسمی نہیں بلکہ دلی خلوص اور محبت کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور میرے نزدیک انتہائی قابلِ قدر۔ ان احباب کے جذبۂ خلوص کا تقاضا تو یہ ہے کہ میں فرداً فرداً سب کا شکریہ ادا کروں لیکن ان کی تعداد کی کثرت اور میری مصروفیت اس کی مانع ہے۔ اس لئے میں، انتہائی معذرت کے ساتھ ان تمام رفقاء اور احباب کا شکریہ ادا کرنے پر اکتفا کرتا ہوں، اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس قسم کے سینکڑوں جشنِ مسرت دیکھنے کے مواقع بہم پہنچائے اور ان کے قرآنی ذوق میں برکت عطا فرمائے۔ والسلام

رہینِ کرم

پرویز

احتساب

(۳)

[تشکیلِ پاکستان کے بعد جتنی حکومتیں وقتاً فوقتاً برسرِ اقتدار آتی رہیں اُن کے قابلِ اعتراض اقدامات پر طلوعِ اسلام کی طرف سے ساتھ کے ساتھ مؤاخذہ ہوتا رہا۔ ان تاریخی حقائق کی یاددہانی کے طور پر، انہیں احتساب کے عنوان سے پیشِ قارئین کیا جا رہا ہے۔ اس کی پہلی قسط طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۷۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور دوسری قسط، اگست ۱۹۷۸ء کے شمارہ میں۔ اب تیسری قسط ملاحظہ فرمایئے۔ قارئین کی طرف سے اس "احتساب" کی یاددہانی کی جس فراخدلانہ انداز سے پذیرائی ہوئی ہے وہ ہمارے لئے بڑی حوصلہ افزا ہے۔]

واہ رے حُسنِ انتخاب

اب فروری ۱۹۵۲ء کا شمارہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ "حقائق و عبر" کے عنوان سے اس شمارہ میں حکومت کی بہت سی لغزشوں اور غلط کاریوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ آئینِ مملکت کی تدوین، قائدِ اعظمؒ کے سوانح حیات کی ترتیب اور دیگر اہم امورِ مملکت کے لئے بعض فرنگی حضرات کی تعیناتی پر اس نے لکھا:۔

ہمارے ہاں سے فرنگی چلا گیا لیکن افرنگیت کا زور پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا ہے۔ حتیٰ کہ ان کاموں کے لئے بھی فرنگیوں کا انتخاب عمل میں آتا ہے جن کے متعلق خود فرنگی کے تصور میں بھی نہ آیا ہوگا کہ انہیں ان کاموں کے لئے بھی چنا جا سکتا ہے۔ مثلاً دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کے دستور کی تسوید کے لئے ایک خالص افرنگی ڈرافٹسمین، مجلس دستور ساز کے سیکرٹریٹ میں مصروف خامہ فرسائی ہیں۔ ان کے بعد ایک اور صاحب بہادر کا انتخاب عمل میں آیا ہے جو ہمیں یہ بتائیں گے کہ ہمارے قائدِ اعظمؒ (مرحوم و مغفور) کیسے تھے۔ غور فرمایئے! قائدِ اعظمؒ ہمارے اور ان کی سیرت نگاری کا کام ایک ایسے صاحب (Mr. BOLITHO) کے سپرد کیا گیا ہے جسے عمر بھر ان سے ملنے تک کا شرف بھی حاصل نہیں ہوا۔ وہ خیر سے پاکستان میں تشریف فرما ہیں اور ہر "راہ رو" سے کہہ رہے ہیں کہ ذرا

قائدِاعظمؒ کی کوئی بات تو سناتے جاؤ۔ کہتے ہیں کہ ان کی "محنتِ شاقہ" پر کوئی پچاس ہزار روپیہ صرف ہو گا۔ اس کے بعد وہ قائدِاعظمؒ کے سوانح حیات قلم بند فرمائیں گے اور کتاب ان کی اپنی ملکیت ہو گی۔ (شمارہ فروری ۱۹۵۲ء۔ صفحہ ۶۸)

آزادی کی نعمتیں!

اسی عنوان سے دوسری چیز، حکومتِ پاکستان کی اس مضحکہ خیز ترمیم سے متعلق تھی جو اس نے پاکستان میں نفاذ پذیر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ (۱۹۳۵ء) میں کی۔ اس سلسلے میں طلوعِ اسلام نے لکھا۔

...... اس میں شبہ نہیں کہ پاکستان میں ہنوز گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء ہی رائج ہے لیکن حکومتِ پاکستان نے اس میں ایسی ایسی اہم تبدیلیاں کر لی ہیں کہ ان سے "غلامی" کی بہت سی شقیں "آزادی" میں بدل گئی ہیں۔ مثلاً گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی شق ۲۶ میں لکھا ہے کہ کوئی شخص مجلسِ مقننہ کا ممبر نہیں بن سکتا اگر
(i) وہ فاترالعقل ہو۔ (ii) دیوالیہ ہو۔ (iii) دو سال یا اس سے زیادہ کی قید کا سزایاب ہو۔ (iv) انتخابات کے سلسلہ میں کسی ناجائز یا خلافِ قانون کارروائی کا مرتکب ہوا ہو۔ اب اس ایکٹ کو اٹھا کر دیکھئے جسے حکومتِ پاکستان نے اپنے ہاں رائج کر رکھا ہے۔ اس میں شق ۲۶ کے سامنے لکھا ہے ——— "حذف کر دی گئی" (OMITTED) غور کیجئے! کس قدر اہم تبدیلی ہے؛ اب ہر فاترالعقل، ہر دیوالیہ، ہر سزایاب یا الیکشن میں "چار سو بیس" کا مرتکب دھڑلے سے ممبر بن سکتا ہے۔ اگر یہ آزادی نہیں تو اور کسے آزادی کہتے ہیں؛ آزادی نام ہے پابندیاں ہٹا دینے کا۔ انگریزوں نے محکوم قوم پر خواہ مخواہ پابندیاں عائد کر رکھی تھیں کہ کوئی پاگل، کوئی دیوالیہ، کوئی مجرم، مجلسِ مقننہ کا ممبر منتخب نہیں ہو سکتا۔ اللہ نے ہمیں آزادی کی نعمت سے نوازا، تو ہم نے ان پابندیوں کو بیک جنبشِ قلم اٹھا دیا۔ سبحان اللہ! آزادی بھی دنیا میں کتنی بڑی نعمت ہے!! اگر ہمیں آزادی نہ ملتی تو پاگلوں کو مجلسِ مقننہ کے بجائے، پاگل خانوں میں بھیجنا پڑتا۔ دیوالیوں اور مجرموں کے لئے قید خانے بنوانے پڑتے۔ اب مسئلہ کیسا آسان ہو گیا؟

ہم بعض وقت سوچتے ہیں کہ اگر انگریز کا قانون علیٰ حالہ رہتا اور ہمیں اس میں تبدیلی کی آزادی نہ ملتی تو ہماری مجلس دستور ساز کی کتنی ہی نشستیں خالی ہو جاتیں! کیا اب بھی تم خدا کی نعمتوں کا شکریہ ادا نہ کرو گے؟ (شمارہ فروری ۱۹۵۲ء۔ صفحہ ۶۹)

نظریۂ اضافیت کے پیکرِ مشہود

ایک صاحب نے آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت (THEORY OF RELATIVITY) سمجھنے کے لئے طلوعِ اسلام کو خط لکھا۔ حقائق وعبر کے انہی کالموں میں اس کا جواب دیا گیا۔ جواب کس قدر

لطیف، دلچسپ اور اس کے ساتھ ہی عبرت آموز تھا۔ اور قومی غیرت کے لئے کتنا گہرا طنز چھپا تھا۔ اس کے بین السطور میں۔ سنیئے!

اب نظریۂ اضافیت کو سمجھنے کے لئے کتابیں پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ کراچی تشریف لے آئیے چار دن میں بات سمجھ میں آجائے گی۔ ایک شخص عمر بھر آپ میں رہتا ہے۔ کسی کو اس کی کوئی خوبی دکھائی نہیں دیتی۔ اسے وزیر یا سفیر بنا دیا جاتا ہے۔ دوسرے ہی دن دنیا بھر کی تمام خوبیاں اس میں جمع ہو جاتی ہیں۔ چاروں طرف سے اس کی حمد و ستائش کے غلغلے بلند ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس کے تدبر و سیاست، فہم و فراست علم و عقل، جہاں بانی و جہاں بینی کے چرچے ساری فضا کو مرتعش کر دیتے ہیں۔ ہر طرف سے آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں کہ؎

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا

میاں تو ایک طرف، بیگم صاحبہ بھی مسائل سلطنت کی عقدہ کشائی میں نور جہاں، مہمات امور کے سر کرنے میں چاند بی بی اور فصاحت و طلاقت میں قرۃ العین سے کم دکھائی نہیں دیتیں۔ یہاں کسی انجمن کا افتتاح ہو رہا ہے۔ وہاں خطبۂ صدارت ارشاد فرمایا جا رہا ہے۔ کہیں کسی نئے کلب کی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔ اخبارات کی پیشانیاں ان کی تصاویر سے مزین کی جاتی ہیں.... کہ اتنے میں میاں صاحب قلمدانِ وزارت یا کرسئی سفارت سے الگ ہو جاتے (یا کر دیئے جاتے) ہیں۔ اور دوسرے ہی دن ان دونوں کی خوبیاں غائب غلہ ہو جاتی ہیں۔

اسے کہتے ہیں "اضافیت" یعنی جہاں ہر خوبی اور قابلیت اضافی ہو، ذاتی نہ ہو، مسندِ حکومت پر آبیٹھے تو اس کی نسبت سے ساری خوبیاں جمع ہو گئیں۔ جہاں یہ نسبت الگ ہوئی، پھر نظام صاحب سقّے کے سقّے۔　(شمارہ فروری ۱۹۵۲ء۔ صفحہ ۷)

مفتیانِ کرام کا فتویٰ

مارچ ۱۹۵۲ء کے "حقائق و عبر" ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ان میں "اب حرام ہے" کے ذیلی عنوان سے ایک اہم مسئلہ سامنے آتا ہے۔

دارالسلطنت (کراچی) میں ایک اہم استفتاء اور مفتیانِ شرعِ مبین کا جواب ایک پوسٹر کی صورت میں بڑی دھوم دھام سے شائع ہوا اور کراچی کے گلی کوچوں میں چسپاں کیا گیا تھا کہ لاٹری سے حاصل کیا ہوا روپیہ شرعاً جائز ہے؟ اور کیا اسے فقراء یا مہاجرین کی آبادکاری جیسے معاملات میں استعمال میں لایا جا سکتا ہے اور جواباً مفتی محمد شفیع، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا عبدالحامد بدایونی اور سید سلیمان ندوی صاحب نے متفقہ طور پر فتویٰ دیا تھا کہ لاٹری حرام ہے اور اس کے روپے کا استعمال گناہِ عظیم۔ یہاں تک بات درست تھی اور اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا (اور بڑا قابلِ غور تھا یہ پہلو)۔ طلوعِ اسلام نے مذکورہ تفصیل

پیش کرنے کے بعد اس دوسرے پہلو کو ایک تازیانۂ عبرت کے طور پر یوں پیش کیا۔

تشکیل پاکستان کے بعد، متعدد نمائشیں لگیں۔ بہت سے مینا بازار منعقد ہوئے۔ ان کے لئے انعامی ٹکٹ بکے۔ لاٹریاں نکالی گئیں۔ لاٹریوں میں انعام بٹے۔ لاٹریاں قوم کی بڑی بڑی برگزیدہ ہستیوں نے نکالیں۔ انعامات معزز خواتین و بیگمات کے ہاتھوں تقسیم ہوئے۔ یہ سب کچھ دارالخلافت کراچی میں بجلی کی جگمگاتی روشنی میں ہوتا رہا۔ حضرات علمائے کرام اسی کراچی میں موجود تھے۔ کسی کو جرأت نہیں ہوئی کہ ان خرافات کے خلاف ایک حرف بھی زبان پر لاتے۔ لیکن اب حالات میں کیا اہم تبدیلی پیدا ہوگئی جو اسی قسم کی لاٹری کے اعلان پر حضرات علمائے کرام کی رگِ شریعت پھڑپھڑا اٹھی۔ اور جھٹ سے فتویٰ سرِبام آگیا۔ ہم گنہگاروں کے نزدیک تو لاٹری (اور قرعہ اندازی) جیسی اب ناجائز ہے، ویسی پہلے بھی تھی۔ لیکن کیا کوئی ان مفتیانِ شرع مبین اور حاملانِ دینِ متین سے اتنا پوچھنے کی گستاخی کرسکتا ہے کہ لاٹری پہلی نمائشوں میں حرام کیوں نہ تھی؟ اور اب کیوں حرام ہوگئی؟ معلوم ہوتا ہے کہ بنیئے کے غلّے کی طرح ان حضرات کا فتویٰ بھی بڑا سمجھدار واقع ہوا ہے۔ وقت بے وقت میں تمیز کر لیتا ہے۔ (شمارہ مارچ ۱۹۵۲ء - صہ)

خودکشی کی وارادات کیوں؟

چونکہ ملک میں مایوسیوں اور پریشانیوں کا دور دورہ تھا اس لئے خودکشی کی وارداتیں اس قدر عام ہورہی تھیں کہ ہر قلب حساس اس سے طلسم پیچ و تاب بن رہا تھا۔ طلوعِ اسلام نے جون ۱۹۵۲ء کے "لمعات" میں ان ہولناک حادثوں کا بالتفصیل تجزیہ کیا اور ان کے محرکات منظرِ عام پر لانے کے بعد لکھا۔

خودکشی کے یہ کثیر التعداد واقعات، درحقیقت، اس جنون اور دیوانگی کے آثار ہیں جو اس وقت قوم کے دماغوں پر مسلط ہوتی جا رہی ہے۔ اس کا سبب دریافت کرنے کے لئے کسی تحقیقاتی کمیٹی کے تعین کی ضرورت نہیں۔ بات بالکل کھلی ہوئی اور واضح ہے۔ تقسیم ہند کے ساتھ مسلمانوں پر جو قیامت گزری تھی وہ کسی قوم کا دماغی توازن کھو دینے کے لئے کم نہ تھی۔ لیکن اس ہولناک مرحلے سے قوم آگے نکل آئی، اس امید کے سہارے کہ پاکستان ان کے خوابوں کی تعبیر، ان کی آرزوؤں کا گہوارہ، ان کی امیدوں کا سہارا، ان کے مستقبل کی خوش حالیوں کا ضامن اور ان کی زندگی کی خوشگواریوں کا کفیل نظر آتا تھا۔ قوم اس صبح درخشاں کی امید کے سہارے، شب تیرہ و تار کی بھیانک ظلمتوں سے آگے نکل آئی۔ لیکن یہاں کی پانچ سالہ زندگی نے ان کی تمام امیدوں کو ایک ایک کرکے توڑ ڈالا۔ انہوں نے اپنے ذہنوں میں جو نقشے قائم کر رکھے تھے وہ ایک ایک کرکے غلط ثابت ہوگئے۔ انہوں نے یہ تو دیکھ لیا کہ وہ رات کی تاریکیوں کو پیچھے چھوڑ آئے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ افقِ پاکستان سے جو صبح نمودار ہوئی ہے وہ کسی امید

کی کرن کو اپنے ساتھ نہیں لائی۔ انہوں نے اس صبح کو دیکھا اور بصد حسرت و یاس پکار اُٹھے کہ:۔

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

تقسیم ہند کی بے پناہ مصیبتوں نے بدن سے قوتِ مدافعت سلب کر لی تھی۔ اس پنج سالہ یاس و ناامیدی نے ان کے اعصاب کے ایک ایک تار کو توڑ ڈالا۔ جن کے اعصاب میں کچھ سکت باقی ہے وہ اپنے لئے موہوم امیدیں پیدا کر کے زندگی کے دن پورے کر لیتے ہیں، جن میں اتنی سی سکت بھی باقی نہیں رہتی وہ اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا کاٹ لیتے ہیں۔ یہ وہ ہیں جن کے دماغی توازن کا بگاڑ اُبھر کر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ورنہ اس وقت حقیقت یہ ہو چکی ہے کہ قوم کا بیشتر حصہ اپنا دماغی توازن کھو چکا ہے۔ کسی میں بات سننے کی تاب نہیں رہی۔ کسی میں برداشت کی قوت نہیں۔ اور غور و فکر کی صلاحیت تو قریب قریب معدوم ہو چکی ہے۔

(شمارہ، جون ۱۹۵۲ء۔ ص ۵)

مجرم کون ہے؟

یہ کچھ وضاحت کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے بتایا کہ اس جگر پاش صورتِ حال کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے ــــ یعنی درحقیقت خودکشی کی واردات کا مجرم کون ہے۔ سنیئے!

سوچیئے کہ کہیں حقیقت یہ تو نہیں کہ اس جرم کا نام ہم نے "خودکشی" اس لئے رکھ چھوڑا ہے کہ اگر خود فریبی یا فریب دہی کا پردہ اٹھ جائے تو خودکشی کرنے والے کے اصل قاتل ہم ہی قرار پائیں گے؛ یعنی کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے جرم قتل کی سزا سے بچنے کے لئے اس کا...... نام خودکشی رکھ چھوڑا ہے تاکہ کسی کی نظر ہم پر نہ پڑے۔

انسانوں کے خود ساختہ قوانین اور ان کو نافذ کرنے والی عدالتیں ان سوالات کا جواب کچھ ہی کیوں نہ دیں، کائنات کا وہ عالمگیر قانون جو آفاقی اور انسانی دونوں دنیاؤں کا محیط ہے، اس قسم کے حادثات کا مجرم اس معاشرہ کو قرار دیتا ہے جس میں خودکشی کرنے والا اپنے لئے زندگی اور اس کی خوشگواریوں کا کوئی سامان نہیں پاتا۔ خودکشی صرف انسانی معاشرے میں ہی ممکن ہے۔ کوئی حیوان خودکشی نہیں کرتا۔ وہ خودکشی کر ہی نہیں سکتا۔ یہ خصوصیت صرف انسانی تمدن کی ہے۔

لہٰذا خودکشی پیدا کردہ ہے اس معاشرہ کی جس میں فرد کو تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے اور تنہا اس لئے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ معاشرہ سمجھتا ہے کہ میرا کام اس کے بغیر بھی چل سکتا ہے۔ یعنی اس معاشرہ میں، فرد معاشرہ کے قیام کے لئے زندہ ہوتا ہے۔ معاشرہ فرد کی حفاظت کے لئے قائم نہیں

ہونا۔ یہ ہے وہ معاشرہ جو انسانوں کے خودساختہ قوانین پر مبنی ہوتا ہے۔
(ایضاً۔ صفحہ ۷)

اس وضاحت کے بعد طلوعِ اسلام قرآنی معاشرہ کی تفصیلات علیٰ وجہ البصیرت پیش کرتا ہے اور اس اہم مقالہ کا اختتام حسبِ ذیل حقیقت پر ہوتا ہے:۔

مسلمان بھی اس وقت فکر و نظر کی پریشانی کا شکار ہے۔ اس کے لئے ابھی کرنے کا کام یہ ہے کہ اس میں ایک آواز پر جمع ہو جانے کی عادت ڈال دی جائے۔ یہ آواز کسی انسان کی آواز نہیں ہو سکتی۔ یہ آواز خود اللہ کی آواز ہے جو قرآن کے ریکارڈ میں محفوظ ہے مسلمانوں کو اسی آواز پر لبیک کہنے کی عادت پڑ جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے۔ طلوعِ اسلام کا مشن صرف اتنا ہے کہ یہ مسلمانوں کے سامنے اس رازِ حیات کو بے نقاب کر دے کہ: استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم (۸/۲۴) اس قرآنی نظام کے مرکز کی آواز پر لبیک کہو جو تمہیں اس چیز کی دعوت دیتا ہے جو زندگی عطا کرنے والی ہے۔ یاد رکھیئے! استجاب (RESPONSE) ہی زندگی کی نشانی ہے۔ زندہ وہ ہے جو کسی کی آواز کا جواب دیتا ہے۔ خدا چونکہ ہمیشہ کے لئے زندہ و پائندہ (الحی القیوم) ہے۔ اس لئے وہ ہر بلانے والی کی آواز کا جواب دیتا ہے۔۔۔۔۔ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان۔ "میں ہر پکارنے والے کی آواز کا جواب دیتا ہوں"۔ اس لئے اس کا مطالبہ بھی یہ ہے کہ: فلیستجیبوا لی (۲/۱۸۶) تم میری آواز پر لبیک کہو۔ میرے بلاوے کا جواب دو۔ خدا کی آواز، اس کا بلاوا، قرآن ہے۔ جس دن مسلمان نے قرآن کی آواز کا جواب دینا شروع کر دیا اسی دن زندگی کی تمام حرارتیں اس کے لئے وجہ گرمیٔ محفل بن جائیں گی۔۔۔۔۔۔۔ جب یہ ہو گیا تو پھر یہ دیکھئے کہ وہ معاشرہ کتنی جلدی وجود میں آتا ہے جس میں زندگی پوری پوری توانائیوں کے ساتھ زمزمہ بار و نغمہ خیز ہو گی۔ اور کوئی فرد اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرے گا۔ اس لئے خودکشی کا لفظ اس کے لغت میں باقی نہ رہے گا۔ آپ نے آج تک کہیں سنا کہ عہدِ رسالتمآبؐ میں کسی شخص نے خودکشی کی ہو؟ وہ معاشرہ تو دنیا میں زندگی بانٹنے کے لئے قائم ہوا تھا۔ اس میں خودکشی کا کیا کام! (ایضاً۔ صفحہ ۶۳)

—————(۰)—————

اگست ۱۹۵۲ء کا آغاز ہوتا ہے۔ مملکتِ پاکستان اپنی زندگی کے پانچ سال پورے کر رہی ہے۔ اسی ماہ کے شمارے میں طلوعِ اسلام اپنے افتتاحیہ میں اس پانچ سالہ عہدِ ماضی کا بھرپور جائزہ لیتا ہے۔ اس کے سامنے قومی زندگی کے مختلف طبقے آتے ہیں۔ اور اس ضمن میں طبقۂ اوّل کے طور پر وہ عوام آتے ہیں جو قوموں کی حیات و ممات میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ ہماری نئی نویلی مملکت میں ان عوام کا کیا

حشر ہوا اور ان کی اہمیت کس بے نیازی سے پسِ پشت ڈال دی گئی۔ طلوعِ اسلام نے اس داستانِ غم کو پیش کرتے ہوئے لکھا :-

ہمارے مطالبۂ پاکستان کی خشتِ اوّل یہی عوام تھے .... یہی عوام ہیں جو خون کے دریا پیرتے اور آگ کے شعلوں سے کھیلتے، نگاہوں میں ایک نئی دنیا کا منظر اور دلوں میں ایک جہانِ نو کا تصور لئے، اپنا سب کچھ برباد کر کے یہاں پہنچے تاکہ پاکستان آباد ہو جائے انہوں نے یہاں پہنچ کر کچھ نہیں مانگا۔ کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ شہروں میں آئے تو بڑے بڑے سر بفلک محلات کے زیرِ سایۂ دیوار رہ گزروں (FOOT PATHS) کے کنارے، بجری کے فرش اور اینٹ کے تکیئے پر، اور اگر دیہات کا رُخ کیا تو سڑک کے کنارے درختوں کے سائے میں یوں اطمینان سے سو گئے گویا ہفت اقلیم کی بادشاہت ان کے حصے میں آگئی۔ ان کے نزدیک تشکیل پاکستان فی الواقع ہفت اقلیم کی بادشاہت تھی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ جب ان کی آنکھ کھلتی تو وہ دیکھتے کہ یہاں ساری دنیا لوٹ میں مصروف ہے۔ لیکن یہ ان کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے نہ دیکھتے۔ ان کے تصورات کی رُو سے پاکستان نام تھا دیانت، امانت اور عدل و انصاف کے سائے میں خوشحالیوں اور خوشگواریوں کی ضمانت کا، دن گزرتے گئے اور ان کی امیدوں کی پر نورانی صبح، یاس انگیز شام کی تاریکیوں میں گم ہوتی چلی گئی۔ حتیٰ کہ ان "خداداد" محلات کے مکینوں کی نگاہوں میں ان کا فٹ پاتھ پر سونا بھی کھٹکنے لگا: انہیں اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر ان خاک نشینوں کو کسی دن فٹ پاتھ کی پستی اور محلات کی بلندی کا تفاوت سچ مچ نظر آنے لگ گیا تو مبادا ان کے دلوں میں نیچے سے اُٹھ کر اوپر جانے کا ولولہ پیدا ہو جائے۔ اس کے لئے انہوں نے ایسا انتظام کیا جس سے وقتاً فوقتاً خطرے کی گھنٹی کھٹکا دی جاتی ہے کہ ان لوگوں کو فٹ پاتھ سے اٹھا دیا جائے گا۔ کیونکہ اس سے "صحتِ عامہ" خطرے میں ہے۔ اس آواز کے سنتے ہی ان بیچاروں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ اور یہ بے ساختہ پکارنے لگ جاتے ہیں کہ

ہمیں فٹ پاتھ سے نہ اٹھایئے

چنانچہ "حسنِ تدبر" کی فسوں کاریوں سے ان عوام کو اس مقام تک پہنچا دیا گیا ہے جہاں ان کی زندگی کے تمام مقاصد اور مستقبل کے تمام تصورات، اپنی خوشحالیوں اور خوشگواریوں کے تمام ممکن مطالبات سے سمٹ سمٹا کر، اس التجا میں مرکوز ہو گئے ہیں کہ "ہمیں فٹ پاتھ سے نہ اٹھایئے" اور اب وہ اس سے زیادہ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہے۔

(شمارہ، اگست ۵۲ء۔ صـ ۶-۷)

پھر معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوتا آگے بڑھتا ہے۔ طلوعِ اسلام کی زبان سے سنیئے :-

یہ ہے وہ مقام جہاں ہمارے عوام کی اکثریت پہنچ چکی ہے۔ طبقۂ اعلیٰ ان کی طرف نہایت

حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اور بات بات پر ان کے عیوب گنانے شروع کر دیتا ہے۔ —— یہ جاہل ہیں۔ غلیظ ہیں۔ بدتمیز ہیں۔ بے ایمان ہیں۔ کام چور ہیں۔ سہل انگار ہیں —— اور آگے بڑھئے تو —— جرائم پیشہ ہیں۔ بے عزت ہیں۔ دیوث ہیں۔ پست اخلاق ہیں۔ کمینہ فطرت ہیں۔ اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔ یہ سب کچھ سچ ہے لیکن ان "ناصحینِ مشفق" سے کون پوچھے کہ ان کے عیوب و اسقام کا ذمہ دار کون ہے؟ انہیں اس حالت تک پہنچایا کس نے دیا۔

شکریہ پرسشِ غم کا، مگر اصرار نہ کر!
پوچھنے والے یہ تیرا ہی کہیں راز نہ ہو (ایضاً۔ ص۳۰)

اس کے بعد دوسرے طبقے کا ذکر یوں شروع ہوتا ہے:۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جس کے نزدیک پاکستان سے مفہوم، دولت سمیٹنا اور جاہ و مناصب کی کرسیاں سنبھالنا ہے۔ ان میں سے کچھ کامیاب ہیں باقی ہنوز ناکام۔ جو کامیاب ہیں وہ اپنی "فتوحات" کی حفاظت کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہیں۔ جو ناکام ہیں وہ اوّل الذکر سے ان "فتوحات" چھیننے اور جھپٹنے کی ہوس میں آشفتہ و پریشان۔ جو ان "فتوحات" کو سنبھالے بیٹھے ہیں وہ اس متاعِ گراں بہا ("دولتِ خداداد") کے تحفظ (یعنی انہیں اپنے تک محدود رکھنے) میں اسلام کی حفاظت اور اس کی تقویت میں پاکستان کی تقویت قرار دیتے ہیں۔ جو لوگ ان فتوحات کو ان سے چھیننا چاہتے ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اگر یہ چیزیں دوسری پارٹی کے پاس رہیں تو اس سے اسلام سخت خطرے میں اور پاکستان موت کے آغوش میں چلا جائے گا۔ برعکس اس کے، اگر یہ مال و منال اور جاہ و اقتدار ان کے ہاتھ میں آجائے تو پھر اسلام محفوظ ہو جائے گا اور پاکستان مضبوط۔ ان میں جو کامیاب ہیں ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم قائدِاعظمؒ کے ترکہ کے جائز وارث اور مسلم لیگ کے مزار کے متولی ہیں۔ اس لئے اس آستانۂ عالیہ کی سجادہ نشینی ہمارا حق اور "خلافت" ہمارا ورثہ ہے۔ (ایضاً۔ ص۴)

پھر ایک اور گروہ سامنے آتا ہے جو مذہب کا نقاب اوڑھ کر اپنے ذاتی مقاصد و منافع کے حصول کے لئے کوشاں ہے۔ اس گروہ کے تاسف انگیز عزائم کی نقاب کشائی کرتے ہوئے طلوعِ اسلام نے لکھا:۔

تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ جب زمامِ اختیار ان لوگوں کے ہاتھ میں آجائے جو خدا کے نام (مذہب) کو اپنی ہوسِ اقتدار کا آلۂ کار بنائیں تو یہ ادوار تاریخِ انسانیت میں سب سے زیادہ دہشت انگیز اور انسانیت کش ہوتے ہیں۔ اس وقت ہر گرگِ خون آشام، برۂ معصوم کی کھال اوڑھ کر سامنے آتا ہے۔ اور ہر ابلیس، خدائی فوجدار ہونے کا مدعی ہوتا ہے۔ جبر و قہر بانبت کے اس انداز سیاست میں جسے مذہبی پیشواؤں (PRIESTS)

کا گروہ "حکومتِ الٰہیہ" (THEOCRACY) کے مقدس نام سے لوگوں پر مسلط کرتا ہے۔ خدا کے نام پر، ہر وہ ظلم و استبداد روا رکھا جاتا ہے جس سے خود ظلم شرمائے اور استبداد کی آنکھوں میں حیا آجائے۔ اہلِ پاکستان کی بدبختی سے آج ان "فتوحات" چھیننے والے ہوس کاروں میں ایک گروہ وہ بھی ہے جو اپنے حصولِ مقصد کے لئے مذہب کو آلۂ کار بنا رہا ہے۔ (ایضاً۔ صفحہ ۔)

ان تمام طائفوں کی حقیقت کو واشگاف طور پر پیش کرنے کے بعد طلوع اسلام ان مخلصین کو مخاطب کرتا ہے جنہوں نے تمام مفادات سے بالاتر ہوکر، تحریکِ پاکستان کے لئے اپنی ہر متاعِ عزیز کی بازی لگائی تھی اور اب صورتِ حال سے مایوس ہوکر گوشہ نشینی میں بسر اوقات کر رہا تھا۔ یہی لوگ تحریکِ پاکستان کے بلند و بالا مقاصد کی بجا آوری کے لئے ملت کا بیش بہا سرمایہ ثابت ہو سکتے تھے..... طلوعِ اسلام ان کے تعارف میں کہتا ہے:۔

یہی گروہ، درحقیقت، ہمارا مخاطب ہے اور انہی سے ہماری توقعات وابستہ ہیں۔ یہ وہ گروہ ہے جس نے تحریکِ پاکستان میں پورے انہماک سے حصہ لیا۔ اس گروہ کے سامنے حصولِ پاکستان سے کوئی ذاتی مفاد نہیں تھا۔ ان کا مقصد صرف اس قدر تھا کہ اس خطۂ زمین میں خدا کے اس نظامِ عدل و ربوبیت کو عملاً نافذ کیا جاسکے جو انسانیت کی نشوونما کا ضامن اور جوہرِ خودی کی برومندی اور بارآوری کا کفیل ہے۔ یہ گروہ ان حسین توقعات کو لے کر پاکستان میں آیا تھا لیکن اس پانچ سال کے عرصے میں انہوں نے جو کچھ دیکھا اس سے یہ سخت شکستہ خاطر ہوگئے۔ اور اب ان کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ یہ مستقبل سے ناامید کر، عملی رہبانیت اختیار کر چکے ہیں۔ (ایضاً۔ صفحہ ۱۶)

اور پھر اس تعارف کے بعد وہ ملت کے ان صاحبِ خلوص اور ایثار پیشہ مجاہدوں کو یوں پیامِ بیداری اور دعوتِ پیکار دیتا ہے:۔

اگر آپ بھی ناسازگاریٔ حالات سے مایوس ہوکر رسمِ خانقاہیت اختیار کرلیں اور دنیا کے ہنگاموں سے منہ موڑ کر، گوشوں اور زاویوں میں روٹھ کر بیٹھ جائیں تو اس نظامِ ربوبیت کی تنفیذ کے لئے جس کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا تھا، کیا آسمان سے فرشتے آئیں گے؟ اگر وہ سر، جن میں ربوبیتِ انسانیہ کو بے حجاب جلوہ فرما دیکھنے کا سودا ہے، اس طرح بادرِ وش ہو جائیں تو کہئے کہ باطل کے انسانیت سوز کارگہِ شیشہ گراں میں کلوخ اندازی کا جنون اپنا مسکن کہاں تلاش کرے؟ اگر وہ دل، جن میں ارضی معاشرہ کو سماوی قوانین سے ہم آہنگ کرنے کا ولولہ موج انگیز تھا، فرطِ یاس سے لحدِ سینہ میں ہم آغوشِ موت ہو جائے تو فرمائیے کہ مفاد پرستانہ مہرہ بازیوں کی بساط الٹنے کا جذبہ کونسے قلب کو اپنا مامن بنائے؟ سوچئے اور جواب دیجئے! اس کا جواب آپ کے ذمے

ہے۔ اگر اس مقام تک پہنچ کر، یوں رو بیٹھ جانا تھا تو
مکتبِ عشق میں کیا کام تھا، آیا کیوں تھا؟ (ایضاً۔ صہ ۱۹)

یہ کہتے ہوئے وہ ان کے سینوں میں امیدوں کے نئے چراغ روشن کرتا ہے اور پکارتا ہے کہ ؎

دل مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

حالات کی نامساعد، مخالفتوں کے ہجوم اور اپنی بے سر و سامانی سے نہ گھبرایئے۔ اس لئے کہ، شعلۂ عشق کی یہ چھوٹی سی چنگاری، جو آپ کے سینے میں زندہ و تابندہ ہے، ہزار سامانوں پر بھی بھاری ہے۔ کیونکہ یہ اپنی زندگی اور تابندگی کے لئے کسی خارجی قوت کی محتاج نہیں۔ اس کی زندگی خود اس کے سوزِ دروں سے قائم ہے۔ اس قائم بالذات زندگی کی رمق، صرف تمہارے ہی حصے میں آئی ہے۔ اس لئے حیاتِ مستعار کے پیکرانِ آب و گل تمہاری اس زندہ قوت کا مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں۔

نورِ قدیمی! شب را برافروز
دستِ کلیمی، در آستینی!

(۰)

قومی اخبارات کی بے ضمیری

دسمبر ۱۹۵۲ء کا شمارہ ہمارے سامنے آتا ہے اور اس کا افتتاحیہ ہمارے اخبارات کی اس خوشامدانہ روش پر ماتم کناں ہے جو ارباب اقتدار کے لئے خود فریبی اور خود سری کے سامان مہیا کرتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں طلوعِ اسلام نے سب سے پہلے شاہی درباروں کے جی حضوریوں کی مثال پیش کی جن کی خوشامدانہ روش نے حکومتوں کو تباہ کیا اور پھر بتایا کہ:۔

آج بھی اسی قسم کے آقا موجود ہیں اور اسی قسم کے مصاحب۔ فرق صرف اتنا ہے کہ، اب اس قسم کا کام پریس (اخبارات) نے لے لیا ہے۔ روح وہی ہے صرف پیکروں کی تبدیلی ہوئی ہے۔

ان کی کیفیت یہ ہے کہ کوئی اسکیم، کوئی تجویز ارباب اقتدار کی طرف سے آئے، ابھی آدھا فقرہ ان کی زبان میں ہوگا کہ ان کی طرف سے سبحان اللہ اور مرحبا کا شور اس طرح بلند ہونا شروع ہو جائے گا جیسے مشاعروں میں کسی استاد کے شاگرد اس کے آدھے مصرع پر تحسین و آفریں کا شور مچا دیتے ہیں۔ ان کی تقریروں کا ایک ایک فقرہ آسمان تک اچھالا جائے گا اور خواہ اس میں زبان تک کی بھی غلطیاں کیوں نہ ہوں۔ انہیں وحیٔ آسمانی کی طرح بے مثل و بے نظیر قرار دیا جائے گا۔ خواہ ساری دنیا انہیں گالیاں دے رہی ہو، یہ انہیں ملت کا محبوب ترین لیڈر کہہ کر پکاریں گے۔ کہیں ان کا جلوس نکلے گا تو ان کے

ساتھ خواہ بھرتی کے خدمت گزار اور حاشیہ بردار پابجولاں، کشاں کشاں کیوں نہ جارہے ہوں، ان کی رپورٹ سے معلوم ہوگا کہ از فرش تا عرش "ملائکہ" قطار در قطار ان کے جلو میں چلے جارہے تھے۔ کسی کانفرنس میں حاضرین نے انہیں خواہ تقریر کرنے کے لئے اٹھنے تک نہ دیا ہو، رپورٹ بتائے گی کہ دو لاکھ کے مجمع نے فلک بوس نعروں سے ان کا استقبال کیا۔۔۔۔۔ جبتک وہ برسرِ اقتدار رہے گا "سب تعریفیں" اس کے لئے مختص ہوں گی۔ اور اگر ایسا ہوا کہ اقتدار کی کرسی اس سے چھن گئی تو دوسرے ہی دن اس کی ایک ایک برائی چن چن کر سامنے لائی جائے گی۔ اور اس جنازہ خوانی کے بعد اسے پھر اسی لحد کے خاموش گوشے میں سلا دیا جائے گا جہاں وہ پہلے پڑا تھا۔ (دسمبر ۱۹۵۲ء۔ صفحہ ۶)

معاملہ اسی پر بس نہیں ہوتا بلکہ قوم کے ان "ترجمانوں" کی خوشامدانہ روش اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ:۔

اگر کوئی شخص (اپنی بدبختی سے) اتنا کہنے کی جرأت کر بیٹھا کہ فلاں معاملہ میں فلاں کمزوری نظر آتی ہے تو مصاحبوں کا یہ ٹولہ چاروں طرف سے قینچیاں ہاتھ میں لئے، اس طرح یورش کر کے آگے بڑھتا ہے کہ ایسا کہنے والے کی زبان کاٹ لی جائے۔ کوئی اسے غدارِ وطن قرار دیتا ہے اور کوئی اسلام کا دشمن۔ اس کے خلاف اس طرح ہنگامہ آرائی کی جاتی ہے اور آقائے نعمت کو یہ کہہ کر فریبِ نفس میں مبتلا کر دیا جاتا ہے کہ آپ ان کی باتوں کی قطعاً پرواہ نہ کیجئے۔ آپ ملت کی آنکھ کا تارا ہیں۔ اور پوری قوم آپ کے قدموں پر جاں نثاری کرنے کے لئے، سربکف منتظر کھڑی ہے۔

قرآن ہمیں بتاتا ہے کہ یہی مصاحب ہیں جن کی وجہ سے افراد تباہ ہوتے ہیں اور قومیں ڈوبتی ہیں۔

قرآن کی زبان سے، اس روش کے تباہ کن نتائج کی وضاحت کرنے کے بعد، طلوعِ اسلام نے لکھا:۔

اگر یہ قوم ضابطۂ خداوندی کو اپنے سامنے رکھتی تو نہ ہی ان مصاحبین کی مجال تھی کہ اہلِ حل و عقد کو اس طرح فریب میں مبتلا رکھتے اور نہ ہی ان اربابِ اقتدار کو اس کی جرأت ہوتی کہ وہ اس طرح فریبِ نفس میں مبتلا ہو جاتے۔ اس وقت قوم کا ہر فرد اربابِ اقتدار کی ہر نقل و حرکت کا محاسب ہوتا اور جو نہی اس کا کوئی قدم قرآن کے راستے سے ادھر ادھر ہونے لگتا چاروں طرف سے خبردار اور ہوشیار کی آواز آتی۔

(ایضاً۔ صفحہ ۹)

اور اس طرح قرآنی حقیقت کو واضح طور پیش کرنے کے لئے اس نے اربابِ اقتدار کو بتایا کہ:۔

جب تک ہمارے اربابِ حل و عقد، حضرت عمرؓ کی طرح، راتوں کو بھیس بدل کر اپنی آنکھوں سے یہ نہیں دیکھیں گے کہ قوم کی حالت کیا ہے اور اپنے کانوں سے نہیں سنیں گے کہ ۔۔۔۔۔۔ کہتی ہے ان کو خلقِ خدا غائبانہ کیا ۔۔۔۔۔۔ اور جب تک قوم کا ہر فرد (عہدِ فاروقیؓ کی) اس بڑھیا جیسی جرأت اپنے اندر نہیں رکھے گا کہ وہ اربابِ حل و عقد کو بتا سکے کہ خلافت اور بادشاہت میں کیا فرق ہے۔ اس وقت تک یہ مصاحبین، اربابِ اقتدار کو برابر فریب میں مبتلا رکھیں گے اور اربابِ اقتدار دیکھتے بوجھتے برابر فریب کھاتے چلے جائیں گے۔ اس لئے کہ فریب میں بڑی لذت ہوتی ہے۔ اور حقائق کا سامنا کرنے کے لئے بڑے بلند کیریکٹر کی ضرورت۔

(ایضاً۔ صفحہ ۹)

باسمہٖ تعالیٰ

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک

(جسے معلوماتِ عامہ کیلئے وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے۔)

جوں جوں ملک میں قرآنی فکر عام ہو رہی ہے، طلوعِ اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ بھی تیزی سے بڑھایا جا رہا ہے حتیٰ کہ بعض طبقوں میں اس کی شدت اشتعال تک پہنچا دی جاتی ہے۔ ہمیں اس پر کبھی اعتراض نہیں ہوا کہ جو کچھ ہم پیش کرتے ہیں اس سے اختلاف کیوں کیا جاتا ہے۔ ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم جو کچھ کہتے ہیں وہ خدا کی طرف سے وحی ہے، جس سے کسی کو اختلاف کا حق حاصل نہیں۔ جو کچھ ہم پیش کرتے ہیں وہ قرآن کریم کی تعلیم کو سمجھنے کی انسانی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس میں سہو بھی ہو سکتا ہے اور خطا بھی۔ جو شخص ہمیں ہماری کسی غلطی پر متنبہ کرتا ہے، ہم اس کے شکرگزار ہوتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی بات کی تائید میں قرآن کریم کی سند رکھتا ہو۔ لیکن ہمارے خلاف پراپیگنڈہ کرنے والوں کی کیفیت جُدا ہے۔ وہ یہ نہیں کرتے کہ جو کچھ "طلوعِ اسلام" کہتا ہے اُسے اُس کے الفاظ میں اپنے قارئین یا سامعین کے سامنے پیش کر کے اس پر قرآن کریم کی روشنی میں تنقید کریں۔ وہ کرتے یہ ہیں کہ اپنی طرف سے ایک غلط بات وضع کرتے ہیں، اور اسے طلوعِ اسلام کی طرف منسوب کر کے گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے "پرویزی فرقہ" کی ایک اصطلاح خود ہی وضع کر کے اسے عام کر رکھا ہے اور جس کے خلاف کچھ کہنا مقصود ہوتا ہے اس کے متعلق مشہور کر دیتے ہیں کہ وہ "پرویزی" ہے۔ حالانکہ اس فرقہ کا وجود ہی دنیا میں نہیں۔ پرویز صاحب اپنے آپ کو "قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم" کہتے ہیں اور اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ چالیس پچاس سال سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت میں مصروف ہیں۔ چونکہ ہماری قوم بھی عام طور پر سہل انگار واقع ہوئی ہے اس لئے کوئی اس بات کی تحقیق کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ جو کچھ طلوعِ اسلام یا پرویز صاحب کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ انہوں نے کہا بھی ہے یا نہیں۔ اس لئے ان مخالفین کا حربہ کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے کہ جو لوگ دیانتداری سے تحقیق کرنا چاہیں ان پر حقیقت واضح ہو جائے، ہم طلوعِ اسلام کے مقصد و مسلک کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں۔ ذیل میں ہم مختصر الفاظ میں اس مقصد و مسلک کو درج کرتے ہیں۔

———(٥)———

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک یہ ہے کہ:-

(۱) تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنے رہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

(۲) خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ابدی ضابطۂ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضورؐ رسالتمآب خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

(۳) قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق

کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابعِ تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

(۴) نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمتِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے۔ سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی اصول صحابۂ کبارؓ کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہیئے۔

(۵) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظامِ مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظامِ زندگی کا نام ہے) ممکن نہیں ہو سکتا۔

(۶) رسول اللہؐ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی، اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امورِ مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

(۷) رسول اللہؐ کے بعد دین کا وہی نظام حضورؐ کے خلفائے راشدین نے جاری رکھا۔ اس میں امورِ مملکت سرانجام پاتے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔

(۸) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور، دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن اب مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

(۹) ہمارے لئے کام کرنے کا یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام و قوانینِ خداوندی کے مطابق چلائے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانینِ خداوندی کے تابع ہوگی۔

(۱۰) چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا۔ اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کیلئے مذہبی پیشوائیت کی طرف اس میں یہ دونوں شعبے باہمدگر مدغم ہو جائیں گے۔

(۱۱) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا، امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز، روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردّ و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اُسے "خدا اور رسول" کا طریقہ قرار دے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما

ہوتی چاہئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی، روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

(۱۳) قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

(۱۴) جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآنِ کریم کے مطابق ہو، یا جس سے حضور نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

(۱۵) ہم، رسول اللہؐ کے بعد، ہر قسم کے مدعیٔ وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

(۱۶) طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہلِ قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ اُمت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں، ہم ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کرتے۔ اور بلا ردّ و بدل ان کی پابندی کرتے ہیں۔ ہم قرآنِ کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مسلک جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ مخالفین کا گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔

—— (۰) ——

جو حضرات طلوعِ اسلام کے اس مقصد سے متفق ہیں وہ مقامی طور پر اس فکر کے عام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی اس تنظیمی کوشش کا نام ہے "بزمِ طلوعِ اسلام"۔ جو لوگ اس بزم کے ممبر بنتے ہیں ان سے کوئی نیا عقیدہ منوایا جاتا ہے نہ احکامِ خداوندی کے علاوہ کسی اور کی اطاعت طلب کی جاتی ہے نہ وہ کوئی الگ پارٹی بناتے ہیں۔ نہ عملی سیاست میں حصہ لے سکتے ہیں۔ نہ وہ کسی کو اپنا پیر و مرشد سمجھتے ہیں نہ امیر و مطاع۔ یہ ان متفق الخیال احباب کی تنظیم ہوتی ہے جو یک نگہی و یک جہتی سے قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کی کوشش کرتے ہیں، اس کے سوا ان کا کوئی پروگرام نہیں ہوتا۔ اور یہ جو کچھ کرتے ہیں اس میں نہ کوئی راز ہوتا ہے نہ پردہ۔ نہ ہی کسی قسم کی جلبِ منفعت۔

المختصر، مسلمانوں کے قلب و دماغ سے ہر قسم کے غیر قرآنی تصورات و نظریات اور معتقدات نکال کر ان کی جگہ خالص قرآنی تصورات پیش کرنا اور دلائل و براہین کی رو سے پیش کرنا طلوعِ اسلام کا مقصود و مطلوب ہے۔ اس میں وہ، قوم کے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو سب سے پہلے اپنے سامنے رکھتا ہے تاکہ، وہ مغربی سیکولرزم اور اشتراکیت کے سیلاب سے بچ کر پاکستان میں صحیح قرآنی معاشرہ قائم کرنے کے قابل ہو سکیں۔

—— (۰) ——

ہمارا پروگرام

اکثر احباب کی طرف سے دریافت کیا جاتا ہے کہ پرویز صاحب کی تصنیف "قرآنی قوانین" کی اشاعت کے بعد ادارہ کا اشاعتی پروگرام کیا ہے۔ چونکہ ان معلومات کا تعلق مفادِ عامہ سے ہے اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ طلوعِ اسلام کے صفحات میں اس کی وضاحت کر دی جائے۔

۱۔ نظامِ ربوبیت

قرآن کریم کے معاشی نظام سے متعلق پرویز صاحب کی یہ کتاب ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی تھی اور اس نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی تھی۔ ایسی شہرت کہ اس کے بعد اسلام کے معاشی نظام کے لئے "نظامِ ربوبیت" کی اصطلاح عام ہو گئی۔ اس کے بعد، معاشیات کے سلسلہ میں مختلف سوالات سامنے آتے رہے اور پرویز صاحب اپنے مقالات، تقاریر اور خطابات میں ان کے جواب دیتے اور نئے نکات کی وضاحت کرتے رہے۔ اس سے اس موضوع پر اچھا خاصا مواد جمع ہو گیا تو مناسب سمجھا گیا کہ نظامِ ربوبیت کا ایسا نیا ایڈیشن شائع کیا جائے جس میں یہ تمام گوشے یکجا سامنے آ جائیں۔ چنانچہ مصنف نے اسے از سرِ نو مرتب کیا اور قرآنی نظام کا موازنہ اور تقابل، مارکسی کمیونزم اور ماؤزے تنگ کے فلسفہ کے ساتھ کر کے یہ بتایا کہ نوعِ انسان کی مشکلات کا حل صرف قرآنی نظام کر سکتا ہے۔ اس جامع تصنیف کی کتابت ہو رہی ہے اور امید ہے کہ مزید دو تین ماہ کے عرصہ میں یہ پریس میں چلی جائے گی۔ معاشیات کے موضوع پر یہ ہمارے لٹریچر میں گرانقدر اور منفرد اضافہ ہوگا۔

۲۔ قرآنی فیصلے

"قرآنی فیصلے" کی چوتھی جلد کی بھی کتابت ہو رہی ہے۔ اس میں بڑے اہم عنوانات شامل ہیں۔

۳۔ مطالب الفرقان کی تیسری جلد

پرویز صاحب کی مایۂ ناز تفسیر، مطالب الفرقان کی پہلی اور دوسری جلد شائع ہونے کے بعد، اس کی اگلی جلد (بلکہ جلدوں) کی اشاعت کا تقاضا شدت اختیار کرتا چلا گیا۔ پرویز صاحب نے تیسری جلد کا مسودہ ایک عرصہ ہوا مکمل کر دیا تھا لیکن اس کی کتابت کے سلسلہ میں ایک ایسی مشکل درپیش رہی جس کا اطمینان بخش حل ابھی تک نہیں مل سکا۔ قارئین کو معلوم ہے کہ ادارہ طلوعِ اسلام کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ پرویز صاحب کی تصانیف کی کتابت اور طباعت بھی معیاری ہو۔ طباعت کے لئے تو ہم نے اوفسٹ کا طریق اختیار کر لیا جو اس وقت ملک میں بہترین تصور کیا جاتا ہے لیکن کتابت کا مسئلہ حل نہیں ہو رہا۔ ملک میں صحافت کے عام ہو جانے سے، کاتبوں کی اکثریت اسی قسم کی کتابت میں مصروف ہو گئی ہے، اور اعلیٰ پایہ کی کتابوں کے لئے جس معیار اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لئے بہت کم خوشنویس میسر آتے ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ معقول معاوضہ کی پیش کش کے باوجود، ہمیں اچھے خوشنویس نہیں ملتے۔ اس مشکل کا ایک حل ٹائپ کی طباعت ہے لیکن ہمیں تجربہ نے بتایا ہے کہ قارئین کی نگاہیں عام

طور پر ٹائپ سے مانوس نہیں ہوتیں اس لئے وہ اس طرزِ طباعت کو پسند نہیں کرتے۔

بہرحال، مطالب الفرقان کی تیسری جلد کا مسودہ مکمل ہے، اور چوتھی جلد پرویز صاحب کے زیرِ تسوید ہے۔

۴۔ تصوّف

تصوّف کے متعلق پرویز صاحب نے جستہ جستہ بہت کچھ لکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس اہم ترین موضوع کے متعلق سیر حاصل اور جامع بحث و تحقیق کی ضرورت باقی تھی، پرویز صاحب آجکل، دیگر مصروفیات کے باوصف اس اہم ترین موضوع کے متعلق تحقیق و تسوید کے لئے بھی وقت نکال رہے ہیں اور ان کے اندازہ کے مطابق اس کے ابتدائی مراحل قریب قریب طے ہو چکے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ "شاہکارِ رسالت" کی طرح ان کی یہ تصنیف بھی، اپنے موضوع پر منفرد ہوگی اور ایک ایسی کمی کو پورا کرے گی، جس کا احساس اکثر ذہنوں کو پریشان اور قلوب کو مضطرب رکھتا ہے۔ اس میں ایک باب "اقبالؒ اور تصوّف" کے عنوان سے بھی ہوگا۔ ایک ایسا صاحبِ فکر، جو تصوّف کے سلوک کی وادیوں سے خود گذرا ہے اور جو علامہ اقبالؒ کے تدبرِ قرآن کا اس قدر مداح ہے، وہ اس موضوع پر جو تحقیق کرے گا، اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا۔

—— (۰) ——

یہ ہے ہمارے اس وقت کے اشاعتی پروگرام کی ایک جھلک۔ قارئین کے دل میں، پرویز صاحب کی تصانیف کے جلد از جلد شائع ہو جانے کی شدتِ آرزو کا ہمیں پورا پورا احساس ہے لیکن اس کے باوجود ہم ان سے درخواست کریں گے کہ وہ ان کتابوں کی اشاعت کے متعلق بار بار استفسار کی زحمت نہ فرمائیں۔ جو کتاب جس وقت بھی شائع ہوئی اس کا اعلان طلوعِ اسلام میں کر دیا جائے گا۔ اس سے پہلے ہم بھی یہ بتا سکنے کے قابل نہیں ہوں گے کہ فلاں کتاب کب شائع ہوگی۔ اس لئے کہ کتابت اور طباعت کے مراحل کے متعلق کچھ بھی یقینی طور پر نہیں کہا سکتا ہے۔ ہمارے ہاں "قطرے کو گہر ہونے تک" معلوم کتنے خلافِ توقع مراحل میں سے گزرنا پڑتا ہے۔

ضرورتِ رشتہ

ایک ۲۳ سالہ دوشیزہ کے لئے جو بی اے۔ بی ایڈ پاس ہے۔ موزوں باروزگار رشتہ درکار ہے۔
تعلیمی لحاظ سے لڑکا گریجویٹ انجینئر ہو یا ڈاکٹری کا سند یافتہ اور عمر ۳۲ سال سے کم۔

(خط و کتابت بصیغۂ راز) ص۔ ع۔ معرفت ادارہ طلوع اسلام
۲۵/ بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

اِسلام میں اجتہاد کی اہمیّت

پروؔیز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؎

کیا احکامِ شریعت میں تبدیلی ہو سکتی ہے؟

(پرویز صاحب کا یہ خطاب، طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷ء میں پیش کیا گیا تھا۔ ہر چند اس موضوع کی اس زمانے میں بھی اہمیت کم نہ تھی لیکن اب جبکہ ملک میں قانون سازی کے مسئلہ نے خصوصی اہمیت اختیار کر لی ہے اور صورت یہ ہے کہ یہ سوال، بھنور میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ایک ہی جگہ چکر کاٹ رہا ہے، آگے ذرا نہیں بڑھ رہا، اس کی اہمیت اور بھی زیادہ ہو گئی ہے۔ اس کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اسے (بادنیٰ لفظی تغیر) دوبارہ شائع کیا جائے اور اس کی اشاعت زیادہ سے زیادہ عام کی جائے)۔

(-)

قوموں کی زندگی میں عبوری دَور، بڑا ہی نازک، کش مکش انگیز، اضطراب خیز، شورش آمیز، محرومِ سکون و مہجورِ طمانیت، اور اکثر و بیشتر یاس پرور اور صبر ربا ہوتا ہے۔ "عبوری دَور" سے مراد ہوتا ہے وہ زمانہ جس میں جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے، وہ زندگی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکے، اور جو کچھ ہونا چاہیئے، وہ ہنوز محسوس و مرتب شکل میں سامنے نہ آیا ہو۔ یہ وہی زمانہ ہے جس کی تصویر جرمنی کے شہرۂ آفاق شاعر، رِلکے (RILKE) نے، ان حقیقت نگار الفاظ میں، مؤثر ترین انداز سے پیش کی ہے کہ:۔

EACH TORPID TURN OF THE WORLD HAS SUCH
DISINHERITED CHILDREN,
TO WHOM, NO LONGER WHAT HAS BEEN, AND NOT
YET WHAT IS COMING, BELONG.

یعنی تاریخ کی گذرگاہوں پر ایسے موڑ بھی آتے ہیں جہاں زمانے کی حرکت کچھ دیر کے لئے ساکن ہو جاتی ہے۔ وہاں ہمیں ایسے محروم الارث، بچے نظر آتے ہیں جن کی حرماں نصیبی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ جو کچھ متواتر چلا آ رہا تھا، وہ ان سے چھن چکا ہوتا ہے، اور جس نے اس کی جگہ لینی تھی، وہ ہنوز ضمیرِ روزگار میں پہلو بدل رہا

ہوتا ہے اور آب و تاب سے موزوں ہو کر سامنے نہیں آیا ہوتا ــــــ یہ، ساماں سوختہ اور متاع بردہ یتیم نسل، ہیم و رجا کے ان دوراہوں پر عجیب کش مکش میں مبتلا دکھائی دیتی ہے۔

ہماری موجودہ نسل

پاکستان کی موجودہ تعلیم یافتہ نسل، اسی کش مکش میں مبتلا ہے، اور بری طرح مبتلا۔ چنانچہ جن گھرانوں کا ماضی مذہبی روایات کے رشتوں سے بندھا ہوا ہے، ان میں اکثر و بیشتر اس قسم کی گفتگو سننے میں آئے گی۔ اس نسل کا جوان سال نمائندہ کہے گا :-

ہم سرکش نہیں ہونا چاہتے۔ ہم تہذیب و اخلاق کی حدود شکنی پسند نہیں کرتے۔ ہم شرافت و نجابت کی انسانیت ساز زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن، چچا جان! آپ سوچئے تو سہی کہ ہم سے مطالبہ کیا کیا جا رہا ہے؟ دنیا ہزاروں سال آگے بڑھ چکی ہے۔ زمانہ کہیں سے کہیں پہنچ چکا ہے۔ زندگی کے تقاضے کچھ سے کچھ ہو چکے ہیں۔ زیست کے انداز بدل چکے ہیں۔ تمدن و معاشرت کی روشیں بدل چکی ہیں۔ زندگی کا ہر نظام ــــــ سیاسی معاشرتی، معاشی، تمدنی، ملّی، بین الاقوامی ایک ایک کرکے، نئے قالبوں میں ڈھل چکا ہے۔ فکر کی فرسودہ راہیں پامال ہو چکی ہیں۔ سوچ کے طور طریق بدل چکے ہیں۔ غرضیکہ زندگی کے ہر گوشے میں تبدیلی آ چکی ہے۔ لیکن ہم سے کہا جا رہا ہے کہ تم اسی انداز کی زندگی بسر کئے جاؤ جس انداز کی زندگی آج سے ہزار سال پہلے بسر کی جاتی تھی۔ تم اپنے اوپر انہی پابندیوں کو عائد کرو جو پابندیاں صدیوں پہلے کے انسانوں پر عائد کی گئی تھیں، تم سوچو تو انہی کے دماغ سے، سمجھو تو انہی کے دل سے، دیکھو تو انہی کی آنکھوں سے، سنو تو انہی کے کانوں سے۔ تم انہی کے متعین کردہ راستوں پر چلتے رہو، انہی کی وضع اور اختیار کردہ روشوں پر گامزن رہو۔ تم ہر نظریہ کو انہی کے پیمانوں سے ماپو، ہر عقیدہ کو انہی کی کسوٹی پر پرکھو۔ جسے وہ غلط کہہ چکے ہیں، اسے غلط کہو، جسے انہوں نے صحیح قرار دیا ہے اسے صحیح سمجھو ــــــ یہ ہے جو ہم سے کہا جا رہا ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ہم سے کہا یہ جا رہا ہے کہ اگرچہ تم بیس چوبیس سال کے جوان ہو چکے ہو لیکن تمہیں وہی جوتا پہننا پڑے گا جو تمہیں دس سال پہلے بنوا کر دیا تھا کیونکہ وہ جفت ساز اپنے زمانے کا بہترین کاریگر تھا۔ اور جب ہم کہتے ہیں کہ اس دس سال کے عرصہ میں ہمارے پاؤں کتنے ہی بڑھ گئے ہیں اور جوتا! تنے کا اتنا ہی ہے، اس لئے اب وہ فٹ نہیں بیٹھتا تو ہمیں کوسا جاتا ہے کہ تم بدتمیز ہو گئے ہو، گستاخ ہو گئے ہو۔ بڑوں کے سامنے بولتے ہو، بزرگوں کا ادب احترام نہیں کرتے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ہم اس کا کیا جواب دیں! ہمیں یہ علامہ اقبالؒ کے اس قسم کے شعر سنانے رہتے ہیں کہ ؎

زمانے کے انداز بدلے گئے نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

لیکن جب ہم ان سے یہ کہتے ہیں کہ ابا جان! زمانے کے انداز بدلے جا چکے ہیں، اس لئے ہمیں بھی اپنے آئین و ضوابط میں تبدیلیاں کرنی چاہئیں تاکہ، یہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے تقاضے پورے کر سکیں تو ہمیں ڈانٹ دیا جاتا ہے کہ زمانے کے حالات خواہ کتنے ہی بدل جائیں اور اس کے تقاضے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائیں، یہ آئین و ضوابط ایسے ہی رہیں گے اور ان کی پابندی اسی طرح کرنی ہوگی۔ یہ شریعت کے احکام ہیں جن میں قیامت تک کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ یہ ہمارے اسلاف کے فیصلے ہیں جو تم سے زیادہ سمجھدار تھے اور زمانے کے تقاضوں کو تم سے کہیں بہتر سمجھتے تھے۔ اور پھر وہ بزرگ، تقویٰ اور پرہیزگاری میں اس مقام پر تھے کہ جس کی گرد کو بھی تمہارا زمانہ نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے ہم ان کے خلاف ایک لفظ تک سننا بھی گوارا نہیں کر سکتے۔ یہ ان کی سوءادبی ہے۔ یہ زمانہ ہی گستاخوں اور بے ادبوں کا آگیا ہے۔

اور جب بات یہاں تک پہنچ جائے تو آپ ہی فرمائیے، چچا جان! کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟

گھروں کے اندر تو بات یہیں تک پہنچ پاتی ہے، لیکن جب یہ موضوع محراب و منبر سے چھڑتا ہے تو جس قدر شکن آلود پیشانیوں، قہر آمیز نگاہوں اور کف بردہاں سیلابوں کے ساتھ قوم کے نوجوانوں کو ہدفِ طعن و تشنیع اور نشانۂ سب و شتم بنایا جاتا ہے، اور جس جس قسم کے کفر و الحاد کے جگر پاش فتووں اور بے دینی و بے حیائی کے نفرت انگیز القابوں سے انہیں نوازا جاتا ہے، اس سے کون سا کان نا آشنا، اور کونسا قلب نامانوس ہے؟ اور اس کے ردِّ عمل میں، جب یہ نوجوان "کافی ہاؤسوں" میں اس سوال کو موضوعِ گفتگو بناتے ہیں، تو پھر کونسی پھبتی ہے جو قدامت پسندوں کے خلاف کسی نہیں جاتی، اور کونسا فقرہ ہے جو مذہب پرستوں پر چست نہیں کیا جاتا ہے۔

قوم کی کشتی، افراط و تفریط کے اسی گرداب میں پھنسی ہوئی ہے۔ دریا کی تلاطم خیزیاں، لمحہ بہ لمحہ بڑھتی جا رہی ہیں اور ان کے تھپیڑوں سے کشتی روز بروز کمزور سے کمزور تر ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ناخدا جن کے ذمے اس کی حفاظت و سلامتی تھی، اسے بھنور میں چھوڑ کر، لبِ ساحل آرمیدہ ہیں۔ اور نہایت ذوق و شوق اور جذب و انہماک سے اس کے ڈوبنے کا تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ آئیے فرصت کے ان چند لمحات میں ہم دیکھیں کہ اس کشمکش کی حقیقی وجہ کیا ہے اور اس کشاکش کا حل کیا؟

پہلے ہم ان نوجوانوں کو لیتے ہیں کہ انہیں سنبھالنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اگر ہمارے یہ نوجوان آنلپڑھ قسم کے عامی ہوتے تو ہم ان سے کہتے کہ ایک بچہ بیس سال کا چھوڑ چالیس، پچاس،

تعلیم یافتہ طبقہ

ساٹھ، ستر سال کا بھی کیوں نہ ہو جائے، اس کی شکل و شباہت، قد و قامت، وضع قطع، بود و ماند حتیٰ کہ اس کی ذہنیت و قابلیت، اس کے امیال و عواطف، اس کے رجحانات و میلانات، غرضیکہ اس کی زندگی کے ہر عنصر میں تبدیلی آجائےگی،

لیکن ایک حقیقت ایسی ہوگی جس پر ان تبدیلیوں کا کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ وہ اس کی زندگی کے پہلے دن سے آخری دن تک، اٹل اور غیر متبدل رہے گی۔ یعنی یہ کہ اس کے ماں باپ کون ہیں۔ اس حقیقت کو نہ وہ بدل سکتا ہے، نہ زمانے کے تقاضے اس میں ذرا سی بھی تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔ لہٰذا، ہمارے ان نوجوانوں کا یہ دعویٰ صحیح نہیں کہ زمانے کے بدلنے سے ہر شے میں تبدیلی آجانی چاہیئے۔ دنیا میں کچھ چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی کیفیت یہ ہے کہ ؎

نہ وہ بدلے، نہ دل بدلا، نہ دل کی آرزو بدلی
میں کیسے اعتبارِ انقلابِ آسماں کر لوں؟

لیکن چونکہ ہمارا یہ نوجوان طبقہ تعلیم یافتہ ہے اس لئے ہم ان سے، ان کی ذہنی سطح پر، ان کی زبان میں گفتگو کریں گے اور ان سے کہیں گے کہ زمانے کے بدلنے والے تقاضے بجا اور درست، لیکن کیا زندگی کی بعض حقیقتیں ایسی نہیں جن پر ان تبدیلیوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ اپنی جگہ اٹل اور محکم رہتی ہیں۔ کیا سائنس کے بنیادی قوانین، زمانے کی تبدیلیوں کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں؟ کیا جیومیٹری کی (PROPOSITIONS) آج بھی وہی نہیں جو آج سے تین ہزار سال پہلے تھیں، جب وہ دریافت ہوئی تھیں۔ کیا ریاضی اور الجبرا کے اساسی اصول، ازل تا ابد، غیر متبدل نہیں رہتے۔ کیا حساب کا یہ ابتدائی سا گُر کہ دو طاق عددوں (ODD NUMBERS) کی حاصل جمع ہمیشہ جفت (EVEN) ہوتی ہے، کسی حالت اور کسی زمانے میں بھی قابلِ تغیر و تبدل ہو سکتا ہے! لہٰذا، یہ مطالبہ کہ زمانے کے حالات کے بدل جانے سے، ہر شے میں تبدیلی پیدا کر دینی چاہیئے، دنیائے علم و حقائق میں قابلِ تسلیم قرار نہیں پا سکتا۔ زمانے کے تقاضے لاکھ بدلیں، ناقابلِ تغیر حقیقتیں ہمیشہ ناقابلِ تغیر رہیں گی۔

قدامت پرست طبقہ

اور دوسری طرف ہم اپنے قدامت پرست بزرگوں کی خدمت میں عرض کریں گے کہ زندگی کی بقا کے لئے غذا کی ضرورت لاینفک ہے۔ یہ ایک ایسا کلیہ ہے جس میں نہ نوعِ انسانی کی پوری تاریخ میں کبھی تبدیلی ہوئی ہے اور نہ ہی کسی فرد کی زندگی میں اس میں استثناء پایا گیا ہے۔ یہ زندگی کا غیر متبدل قانون ہے لیکن اس کے ساتھ ہی آپ اس پر بھی غور فرمائیے کہ یہ تفاصیل کہ آپ کس قسم کی غذا کھاتے ہیں، کس طریق سے کھاتے ہیں، کن کن اوقات میں کھاتے ہیں، ایسی ہیں جن میں ہر زمانے میں، ہر قوم میں، ہر ملک میں، تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک فرد کی زندگی کے مختلف ادوار اور مختلف حالات میں ان میں تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ آپ کی بچپن کے زمانے کی غذا اور تھی، جوانی کی اور، اور بڑھاپے کی، ان دونوں سے مختلف۔ تندرستی کے زمانے میں غذا اور ہوتی ہے، بیماری کے دنوں میں اور۔ سردی میں اور قسم کی غذا کھانی پڑتی ہے۔ گرمی میں اور قسم کی۔ کلیہ غیر متبدل ہے لیکن اس کی عملی جزئیات میں، حالات کے بدلنے سے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔

ان تمہیدی تصریحات کے بعد آئیے ہم دیکھیں کہ ایک مسلمان کی زندگی میں کیا کیا چیزیں غیر متبدل ہوتی ہیں، اور کونسی ایسی، جن میں حالات کے مطابق تبدیلیاں لائی جا سکتی ہیں۔ یہ سوال صرف اس لئے اہم نہیں کہ اس

سے ہماری قدیم اور جدید نسل میں ایک شدید کشمکش پیدا ہو رہی ہے۔ اس کی اہمیت کی، اس کے علاوہ، ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ وجہ بنیادی ہے۔ اسے غور سے سنیئے۔

اس مطالبہ میں کسی کو بھی اختلاف نہیں کہ پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ ہونے چاہئیں، لیکن اس کے باوجود، اس تئیس سال کے عرصہ میں، ان قوانین کی ترتیب و تدوین کے لئے ایک عملی قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکا۔ یہ اس لئے کہ ابھی تک یہ بنیادی سوال طے نہیں پا سکا کہ اسلامی قانون کہتے کسے ہیں۔

پاکستان میں بنیادی سوال

اس میں کون کون سے اجزاء غیر متبدل ہیں اور کون کون سے ایسے جن میں، بہ تغیرِ حالات تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ منیر کمیٹی میں یہ سوال اٹھایا گیا تو علماء حضرات نے کہا کہ اسلام میں، مکمل ضابطۂ قوانین پہلے سے موجود ہے جس میں نہ کسی اضافہ کی ضرورت ہے، نہ کسی تبدیلی کی اجازت۔ حکومت کا فریضہ یہ ہے کہ وہ اس ضابطۂ قوانین کو من و عن نافذ کر دے اور اگر کسی مسئلہ کی تعبیر و تشریح کی ضرورت پڑے تو علماء کی طرف رجوع کرے۔ دوسری طرف، ارباب بست و کشاد، جن کے سر پر ملکی قوانین کو عملاً نافذ کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی، یہ محسوس کرتے تھے کہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر، علماء کے پیش کردہ ضابطۂ قوانین کو من و عن نافذ کرنا ناممکن ہے۔ لیکن ان کی کمزوری تھی یا تقاضائے مصلحت کہ وہ جس حقیقت کو محسوس کرتے تھے اُسے کھلے کھلے الفاظ میں زبان پر نہیں لاتے تھے۔ چنانچہ اس دوران میں جتنی حکومتیں قائم ہوئیں، ہر ایک نے اسی میں عافیت سمجھی کہ دستور میں تو یہ شق رکھ دی جائے کہ ملک کے قوانین اسلامی ــــ یعنی کتاب و سنت کے مطابق ــــ ہوں گے لیکن اس سے آگے کسی نے ایک قدم بھی نہ اٹھایا۔ ہر ایک کی یہی کوشش رہی کہ یہ سوال کسی نہ کسی طرح ٹلتا چلا جائے۔ دوسری طرف علماء حضرات بھی اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ہمارے ہاں تو ایک طرف، دنیائے اسلام میں کسی جگہ بھی کوئی ایسا ضابطۂ قوانین موجود نہیں جسے تمام فرقوں کے مسلمان متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کرتے ہوں۔ نہ ہی فرقوں کی موجودگی میں ایسا ضابطۂ قوانین مرتب ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ بھی عافیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ یہ سوال عملاً سامنے آئے ہی نہیں۔ میرا تعلق، نہ اربابِ حکومت سے ہے نہ ابنائے شریعت سے ــــ اقبالؒ کے الفاظ میں، میں ؎

نے ابلہِ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

ہوں قرآن کریم کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ اور میرا مسلک یہ ہے کہ زندگی کا کوئی مسئلہ سامنے آئے، قرآن کی بارگاہ سے پوچھوں کہ اس کا حل کیا ہے۔ قرآن کریم پر غور و تدبر سے، اس اہم ترین اور (بظاہر) مشکل ترین مسئلہ کا حل، میری بصیرت کے مطابق مجھے مل سکا ہے۔ اسے آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت ہماری قوم اس (mood) ہی میں نہیں کہ کسی مسئلہ پر

ے اب تیس سال کہیئے۔ (۱۹۷۸ء)۔

سنجیدگی سے غور کر سکے۔ اس کے باوجود، میں اس سوال کو سامنے لا رہا ہوں، اس امید پر کہ شاید اس کے بعد ہمارا نصیبہ یاوری کرے اور قوم اس قسم کے بنیادی مسائلِ حیات پر غور و فکر کی ضرورت محسوس کرے، تو میری قرآنی فکر کے یہ نتائج اس کے کسی کام آسکیں۔ ورنہ اس وقت تو ؎

مثال یہ مری کوشش کی ہے مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

(۰)

انسان کو جب اس دنیا میں بسایا گیا تو اس سے کہہ دیا گیا کہ زندگی کے بنیادی مسائل کا اطمینان بخش حل تنہا عقل کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے تمہیں آسمانی راہ نمائی ملتی رہے گی۔ فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ (۲/۳۸) جو اس راہنمائی کا اتباع کرے گا وہ بلاخوف و خطر، اور بے حزن و ملال منزلِ مقصود تک پہنچ جائے گا۔ اس راہ نمائی کے لئے پروگرام تو یہی تھا کہ

آسمانی راہ نمائی

زندگی کے بنیادی اور غیر متبدل اصول و اقدار کو وحی کی رو سے دیا جائے اور اس بات کو ہر دور کے انسانوں پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق عمل طریق کار خود وضع کریں۔ لیکن شروع شروع میں انسانی عقل و شعور خام اور اس کا تجربہ ناپختہ تھا، اس لئے ان اصولوں کی بیشتر جزئیات بھی خود وحی کی رو سے متعین کر دی جاتی تھیں۔ مثلاً جب حضرت نوحؑ سے کہا گیا کہ وہ آنے والے سیلاب سے محفوظ رہنے کے لئے کشتی بنائیں، تو کشتی بنانے کا طریق بھی وحی کی رُو سے بتایا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ: وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا۔ (۱۱/۳۷) "تم ہماری زیرِ نگرانی، ہماری وحی کے مطابق کشتی بناؤ۔" اس طرح ایک رسول، غیر متبدل اصول و ضوابط اور اپنے زمانے کی ضروریات کے مطابق، جزئیات و تفاصیل اپنی اُمت کو دے کر چلا جاتا۔ لیکن اس کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ہوتا یہ کہ اس کے نام لیوا، مذہبی پیشوا، اپنی مفاد پرستیوں کے لئے، اس کی وحی میں اپنے خیالات کی آمیزش کر دیتے اور کہیں وہ دست بردِ زمانہ سے ویسے ہی تلف ہو جاتی۔ اس کے بعد ایک اور رسول آجاتا اور ایک جدید ضابطہ حیات بذریعہ وحی دے دیتا۔ اس میں غیر متبدل اصول تو وہی ہوتے، جو سابقہ رسول کی وحی میں تھے لیکن جزئی احکام کا از سرِ نو جائزہ لیا جاتا۔ ان میں جو احکام ایسے ہوتے جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جاتا۔ جن میں تبدیلی کی ضرورت ہوتی ان کی جگہ جدید احکام دے دیئے جاتے اور عند الضرورت ان میں اضافہ بھی کر دیا جاتا۔ یہی وہ نظامِ وحی ہے جسے قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے کہ: مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا۔ (۲/۱۰۶) جو (سابقہ) حکم ہم منسوخ کر دیتے تھے اس کی جگہ اس سے بہتر حکم نازل کر دیتے تھے۔ اور جو احکام ایسے تھے جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں تھی لیکن انہیں فراموش کر دیا گیا تھا، ان کی دوبارہ ــــــ

ملا اور اب تو حالت اس سے کہیں زیادہ تاسف انگیز ہے۔ (۱۹۷۸ء)

تجدید کر دی جاتی تھی ـــــــ دوسرے مقام پر اسے "تبدیلِ احکام" کے پروگرام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (۱۶/۱۰۱)۔

یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تا آنکہ تاریخِ انسانیت میں اس دور کا آغاز ہو گیا جس میں ذہنِ انسانی نے بلوغت تک پہنچ جانا تھا۔ اس کی علمی اور فکری صلاحیتوں میں پختگی آ جانی تھی۔ اس کے تجربہ اور مشاہدہ کے

آخری ضابطۂ حیات

میدان، افق تا افق پھیلتے چلے جانے تھے۔ تو اس وقت نوعِ انسان کو وحی کی رو سے آخری ضابطۂ حیات عطا کیا گیا جسے قرآن کریم کہا جاتا ہے۔ اس میں کچھ تو جزئی احکام تھے اور باقی زندگی سے متعلق وہ ابدی اصول و اقدار جو شروع سے غیر متبدل چلے آتے تھے اور جنہیں، قوانینِ کائنات کی طرح، ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہنا تھا ـــــ انہی اصولوں کے متعلق کہا گیا کہ: شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ...... (۴۲/۱۳)۔ تمہارے لئے بھی وہی الدّین ـــــ ضابطۂ حیات ـــــ تجویز کیا گیا ہے جو انبیائے سابقہ ـــــ مثلاً نوح، ابراہیم، موسےٰ اور عیسیٰ (علیہم السلام) کی طرف وحی کیا گیا تھا۔ ان سے بھی ہم نے یہی کہا تھا ـــــ اور تمہیں بھی اسی کی تاکید کی جاتی ہے ـــــ کہ اس ضابطۂ حیات میں کسی قسم کا اختلاف اور تفرقہ پیدا نہ کرنا ـــــ اس لئے کہ زندگی کے اساسی قوانین و اقدار میں اختلاف یا تفرقہ، نظامِ حیات کو درہم برہم کر دیتا ہے ـــــ یہی وہ الدّین ـــــ غیر متبدل اصولِ حیات کا ضابطہ ـــــ تھا جس کا مھیمن (محفوظ ریکارڈ) قرآن کریم تھا (۵/۴۸)۔ ان اصولوں کے علاوہ جو کچھ اقوامِ سابقہ کو بذریعہ وحی دیا گیا تھا، وہ احکامِ شریعت تھے جو قابلِ تغیر و تبدل تھے۔ انہی کے متعلق کہا تھا کہ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا۔ (۵/۴۸)

اہلِ کتاب کا اعتراض

سابقہ مذاہب کے پیرو (اہلِ کتاب) چونکہ ان جزئی احکام کو بھی ناقابلِ تغیر و تبدل سمجھتے تھے، اس لئے وہ اعتراض کرتے تھے کہ اگر یہ دین، جسے رسول اللہ ﷺ پیش کرتے ہیں، وہی ہے جو انبیائے سابقہ کو دیا گیا تھا تو قرآن کے بعض احکام، اُن کے ہاں کے احکام سے مختلف کیوں ہیں؟ ان سے کہا گیا کہ اوّل تو تم نے اپنے رسول کے عطا کردہ ضابطۂ ہدایت میں تحریف کر دی اور دوسرے یہ کہ ان جزئی احکام میں تبدیلی ضروری ہے۔ الدّین، ناقابلِ تغیر اصولوں کا نام ہے۔ ان کے متعلق کسی قسم کا تنازعہ نہیں کیا جا سکتا ـــــ لِّكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ ۖ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ۔ (۲۲/۶۷) اس سے واضح ہے کہ الامر غیر متبدل اصولِ دین ہے، اور بدلتے رہنے والے احکام، مناسک و مناہج۔ انہی اصولوں کو، جو آخری مرتبہ قرآن میں دیئے گئے تھے، مکمل بھی کہا گیا اور غیر متبدل بھی۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۚ لَّا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ۔ (۶/۱۱۶) تیرے رب کے کلمات صدق و عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ انہیں قرآن کریم میں مکمل کر دیا۔ اور قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا ـــــ

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ - (۱۵/۹) "ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں"۔ اس کے بعد وحی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ بابِ نبوت ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

قرآن کریم کا یہ حصہ دین کے اصولوں سے متعلق ہے۔ جہاں تک ان احکام کا تعلق ہے جو اس میں مذکور ہیں، وہ بھی کم و بیش اصولی نوعیت کے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہر حکم، خاص شرائط سے مشروط ہوتا ہے۔ اور اسے خاص حالات کے تحت نافذ کیا جاتا ہے۔ مگر قرآن میں نہ تو ان احوال و ظروف کا تعین کیا گیا ہے جن کے مطابق ان احکام کو نافذ کیا جائے گا اور نہ ہی ان شرائط کا ذکر ہے جن سے وہ مشروط ہوں گے۔ (مثلاً) اس میں سرقہ (چوری) کو قابلِ سزا جرم قرار دیا گیا ہے۔ لیکن سرقہ کی تعریف (DEFINITION) خود متعین نہیں کی۔ اس نے اضطراری حالت میں حرام چیزوں کے کھانے کی اجازت دی ہے لیکن ان حالات و کیفیات کی وضاحت نہیں کی جنہیں اضطراری کہا جائے گا۔ اس نے خمر اور میسرہ کو ممنوع قرار دیا ہے لیکن ان کی نوعیتوں اور شکلوں کی تصریحات خود بیان نہیں کیں۔ اس نے ان کا تعین انسانوں پر چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ احوال و ظروف بدلتے رہتے ہیں اور نہ ہی شرائط غیر متبدل ہو سکتی ہیں۔

یہی الدّین ہے

یہ ہیں وہ اصول و اقدار اور احکام و ضوابط جو قرآن میں مذکور ہیں۔ انہی کے مجموعہ کا نام "الدّین" ہے۔ جن امور کے متعلق قرآن خاموش ہے، ظاہر ہے کہ ان کا تعلق دین سے نہیں۔ ان کے متعلق اس نے مسلمانوں سے تاکیداً کہہ دیا کہ ان کی بابت خواہ مخواہ کرید مت کرو۔ اگر ان کا تعلق دین سے ہوتا تو انہیں ہم خود ہی بتا دیتے۔ سورۃ مائدہ میں ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ۔

"اے جماعتِ مومنین! جن امور کے متعلق زبانِ وحی خاموش رہی ہے، ان کے متعلق خواہ مخواہ سوالات مت کرو۔ ابھی نزولِ وحی کا سلسلہ جاری ہے۔ تمہارے سوالات کے جواب میں اگر وحی کی رو سے کچھ مزید احکام دے دیئے گئے تو وہ تمہیں ناگوار گزریں گے۔ سو تم مفت میں بیٹھے بٹھائے اپنے اوپر پابندیاں عاید کرانے کا موجب کیوں بنتے ہو؟ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِّن قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ۔ (۵/۱۰۲) تم سے پہلے ایک قوم (بنی اسرائیل) ایسی حماقت کر چکی ہے۔ اس نے خواہ مخواہ اپنے اوپر قسم قسم کی پابندیاں عاید کر کے زندگی کو ناقابلِ برداشت زنجیروں میں جکڑ لیا۔ اور جب انہیں نباہ نہ سکے تو دین ہی سے برگشتہ ہو گئے۔ تم ایسا نہ کرنا۔ جن امور کے متعلق وحی خاموش رہی ہے، یہ نہیں کہ ہم ان کے متعلق ہدایات دینا بھول گئے ہیں۔ ہم دانستہ خاموش رہے ہیں کہ ان امور کا تعلق دین سے ہے ہی نہیں۔ اس لئے ان کے سلسلہ میں کوئی پابندیاں نہیں لگائی گئیں۔ اس آیۂ جلیلہ کی تشریح حضور نبی اکرمؐ

نے ایک حدیث میں یوں فرمائی ہے کہ: اِنَّ اللّٰہَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَیِّعُوْھَا۔ وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَھِکُوْھَا۔ وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْھَا وَسَکَتَ عَنْ اَشْیَآءٍ مِّنْ غَیْرِ نِسْیَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْھَا۔" اللہ نے کچھ امور کو فرض قرار دیا ہے، انہیں ضائع مت کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، ان کے پاس تک نہ پھٹکو۔ کچھ حدود متعین کی ہیں، ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور دیگر امور کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے، ان کے متعلق کریدمت کرو۔ یاد رکھو! جن باتوں کے متعلق اللہ نے خاموشی اختیار کی ہے، اس نے دانستہ ایسا کیا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ —— (معاذ اللہ) بھول گیا ہے۔" (مشکوٰۃ: باب تمسک بکتاب وسنت)

میں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

حاصلِ بحث

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ ختمِ نبوت کے بعد، انسانی راہ نمائی کی صورت یہ قرار پائی کہ:۔

۱۔ جن امور کے متعلق قرآنِ کریم نے اصولی راہ نمائی دی ہے، جماعتِ مومنین، یعنی اسلامی مملکت، اُمت کے مشورہ سے، اپنے حالات کے مطابق، یہ خود طے کرے کہ ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے کیا طریق کار اختیار کیا جائے۔

۲۔ جہاں تک احکامِ قرآنی کا تعلق ہے، اسلامی مملکت ان مواقع، حالات اور شرائط کا تعین کرے جن کے مطابق انہیں نافذ کیا جائیگا۔

۳۔ اسلامی مملکت اس امر کا بھی فیصلہ کرے کہ قوم کے موجودہ حالات کیا ہیں، اور قرآنی اصول و احکام کو کس طرح نافذ کیا جائے کہ وہ بتدریج آہستہ آہستہ، آخری منزل تک پہنچ جائے۔ یعنی نصب العین تو قرآن نے متعین کر دیا ہے۔ اس نصب العین تک بتدریج پہنچنے کیلئے عملی پروگرام حالات کے تقاضے کے مطابق، خود وضع کرے۔ کسی قوم کو اس کی آخری منزل تک لے جانے کے لئے، اصولِ تدریج

اصولِ تدریج

واِمہال کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ خود اللہ تعالیٰ نے بھی، نزولِ وحی میں اس اصول کو پیشِ نظر رکھا تھا۔ حضرت عائشہؓ کی ایک روایت ہے کہ:۔

پہلے مفصّل سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت و دوزخ کا ذکر ہے (یعنی ترغیب و ترہیب سے متعلق آیات)۔ پھر جب لوگ اسلام پر قائم ہو گئے، تو حلال و حرام کے احکام نازل ہوئے۔ (مثلاً) اگر شراب نہ پینے کا حکم شروع ہی میں نازل ہو جاتا تو لوگ کہہ دیتے کہ ہم شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اسی طرح اگر ابتدا ہی میں زنا کی ممانعت کا حکم نازل ہو جاتا تو لوگ اس کے چھوڑنے سے بھی انکار کر دیتے۔ (بخاری باب تالیف القرآن)

(زنا سے غالباً مراد ہیں نکاح کے وہ طریقے جو عربوں کے ہاں رائج تھے، لیکن جنہیں قرآنِ کریم نے ممنوع قرار دے دیا تھا)۔ امتناعِ شراب کے احکام میں جس تدریج کو ملحوظ رکھا گیا وہ اربابِ فکر و نظر کے لئے بڑی

بصیرت افروز ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قوم کی گھٹی میں شراب پڑ چکی ہو، جو نسلاً بعد نسلٍ اس کی عادی چلی آرہی ہو۔ کیف و مستی جس کے خون کے ذرات میں حلول کر چکے ہوں، اس کے لئے ناممکن ہے کہ وہ یک لخت شراب چھوڑ دے۔ وہ اسے تدریج ہی چھوڑ سکے گی۔ اسی حکمت کے پیشِ نظر قرآن کریم میں پہلے یہ آیا کہ خمر و میسرہ میں فوائد بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ لیکن ان کے نقصان، ان کے فوائد سے زیادہ ہیں۔ (۲/۲۱۹)۔ پھر یہ کہا گیا کہ: لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُکٰرٰی (۴/۴۳)۔ تم نشہ کی حالت میں اجتماعاتِ صلوٰۃ میں شریک نہ ہوا کرو، اور اس کے بعد، تیسری منزل میں، اس کی قطعی ممانعت کی گئی۔ (۵/۹۰-۹۱) یہ ممانعت مدینہ میں آکر ہوئی۔ اسی طرح قرآنِ کریم کے دیگر احکام پر نگاہ ڈالیئے۔ نظر آجائے گا کہ اس نے اپنی اوّلین مخاطب قوم کی معاشرتی اور تمدنی سطح، اور ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کو سامنے رکھ کر، ان احکام کو اس طرح تدریج نازل کیا کہ وہ قوم تئیس سال کے عرصہ میں، اس پروگرام کے نقطۂ اوّلیں سے آہستہ آہستہ آخری منزل تک لے جائی گئی۔ جن سطح بین نگاہوں کے سامنے یہ بنیادی حقیقت نہیں، انہیں قرآنی احکام میں جا بجا تضاد نظر آئے گا۔ حالانکہ قرآنِ کریم نے اپنے من جانب اللہ ہونے کی دلیل یہ دی ہے کہ: وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔ (۴/۸۲)۔ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں تم بہت سے اختلاف پاتے۔ تضادات کے اسی غلط تصور نے یہ عقیدہ وضع کرا دیا کہ قرآن کی بعض آیات، دوسری آیات سے منسوخ ہو چکی ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اپنے مقام پر اٹل ہے اور اس کا کوئی حکم منسوخ نہیں۔ ناسخ و منسوخ کا تصوّر ہی غیر قرآنی ہے۔ اس کے احکام احوال و ظروف سے مشروط ہیں اور ان کا اطلاق موقع و محل کے مطابق ہوتا ہے۔ تدبّر فی القرآن سے مراد یہ ہے کہ اس امر کا جائزہ لیا جائے کہ ہمارے جو حالات اس وقت ہیں، ان میں قرآن کا کونسا حکم نافذ العمل ہونا چاہیئے اور کون کونسی شرائط سے مشروط اور کس کس قسم کی قیود سے مقید۔ یہ شرائط و قیود، قرآن کریم کی اصولی راہ نمائی کی روشنی میں، حالات کے مطابق متعین کی جائیں گی۔ یہ کام اسلامی مملکت کے کرنے کا ہے، نہ کہ افراد یا نجی اداروں کا۔

ناسخ و منسوخ کا عقیدہ

―――(۰)―――

قرآنی راہ نمائی کے مطابق سب سے پہلی مملکت، نبی اکرمؐ نے متشکل فرمائی۔ اس سلسلہ میں حضورؐ کو حکم دیا گیا کہ: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳/۱۵۸) معاملات میں، افرادِ امت (یعنی اپنے رفقاء) سے مشورہ کیا کرو۔ قرآنِ کریم کے احکام اور اصول واقدار سب منزّل من اللہ تھے۔ ان میں خود رسولؐ اللہ کے ذاتی خیالات و افکار کا بھی کوئی دخل نہیں تھا چہ جائیکہ اس سلسلہ میں دوسروں سے مشورہ لیا جاتا۔ جو کچھ مشاورت سے طے کیا جانا مقصود تھا وہ یہی تھا کہ جو حالات اس وقت درپیش [illegible]

پہلی اسلامی مملکت

کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے کس قسم کے جزئی ضوابط مرتب کئے جائیں، اور جو احکام قرآن میں آئے ہیں انہیں کونسی شرائط و حدود کے ساتھ نافذ کیا جائے۔ ان امور کے فیصلے، باہمی مشورہ سے طے پاتے تھے۔ اور (ظاہر ہے کہ) ان فیصلوں میں حالات کے مطابق حک و اضافہ اور تغیر و تبدل ہوتا رہتا تھا۔ یہ جو ہمیں کتب احادیث میں، ایک ہی مسئلہ کے متعلق مختلف روایات ملتی ہیں، تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ درحقیقت مختلف اوقات میں طے کردہ مختلف فیصلے ہیں۔ ہماری کتب روایات میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ ان میں فیصلے تو دیئے گئے ہیں لیکن ان احوال و ظروف کی تفصیل و تصریح نہیں دی گئی جن کی روشنی میں وہ فیصلے دیئے گئے تھے۔ قانون دان حضرات سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں کہ کسی فیصلے کے صحیح مفہوم و منطوق تک پہنچنے کے لئے (CASE LAW) کا سامنے ہونا کتنا ضروری ہے۔ امت میں جو اس قدر فرقے پائے جاتے ہیں، تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ایک گروہ نے رسول اللہ کے کسی ایک فیصلہ پر عمل شروع کر دیا اور دوسرے نے کسی دوسرے فیصلے پر۔ اور دونوں نے اپنی اپنی جگہ سمجھ لیا کہ جس فیصلہ پر وہ عمل پیرا ہے، وہ ابدی قانون شریعت ہے، حالانکہ ان میں ابدی قانون کوئی بھی نہ تھا۔ یہ، مختلف احوال و کوائف کے ماتحت، صادر فرمودہ فیصلے تھے، جو حالات کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہتے تھے۔ اس سلسلہ میں ایک عملی مثال پر غور فرمائیے۔

قرآن کریم کی رو سے، زمین (ذرائع پیداوار) پر کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی۔ یہ امت کی مشترکہ تحویل میں رہتی ہے، اور مملکت اس کا انتظام کرتی ہے تاکہ وہ افراد معاشرہ کو رزق بہم پہنچانے کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکے۔ رسول اللہ کے زمانہ میں مختلف اوقات میں مختلف اراضیات مملکت کے قبضہ میں آئیں۔ آپ نے مفاد عامہ کے پیش نظر، حالات کے تقاضے کے مطابق، ان کے متعلق مختلف انتظامات فرمائے۔ مثلاً خیبر فتح ہونے پر، زمین کو مملکت کی تحویل میں لے لیا گیا۔ اس میں سے کچھ حصہ فوجیوں کو دے دیا اور بقیہ حصہ اصل باشندوں کے پاس رہنے دیا اور پیداوار میں حکومت اور اصل باشندوں، دونوں کو شریک کر لیا۔ وادی القریٰ کی کل زمین آپ نے اصل باشندوں کے پاس رہنے دی۔ اس کے برعکس، بنو نضیر، جو جائیداد اور زمین چھوڑ گئے، آپ نے اُسے مملکت کے زیر انتظام، مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ مکہ فتح ہونے کے بعد تمام زمینیں، خلافت کے زیر اہتمام اصل باشندوں کے پاس رہنے دیں۔ ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کا یہ اصول (کہ زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی، وہ مملکت کی تحویل میں رہے گی) تو اپنی جگہ پر اٹل اور غیر متبدل رہا، لیکن زمین کا انتظام، موقعہ اور محل کے لحاظ سے بدلا جاتا رہا۔ (آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ جب عراق کی زمینیں فتح ہوئیں تو حضرت عمرؓ نے ان کا کیا انتظام کیا)۔

اسی طرح جرائم کی سزا کے سلسلہ میں بھی آپ نے مجرموں کے احوال و کوائف اور ان کی ذہنی سطح اور نفسیاتی کیفیت کے پیش نظر مختلف اوقات میں مختلف فیصلے صادر فرمائے۔ مثلاً ایک شخص نے شراب پی اور اپنے آپ کو خود ہی سزا کے لئے پیش کر دیا۔ آپ نے اس کی حالت کا جائزہ لیا اور فرمایا کہ

کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز پڑھی ہے؟ اس نے کہا کہ ہاں پڑھی ہے۔ تو آپ نے فرمایا کہ جاؤ خدا نے تمہارا جرم معاف کر دیا ہے۔ (مشکوٰۃ کتاب الصلوٰۃ) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شخص نے ہمیشہ کے لئے شراب نوشی سے توبہ کر لی ـــــــ یہ تھا اس میں اصلاح کا امکان جس کے پیش نظر حضورؐ نے اس پر تعزیر وارد نہیں کی۔ ایک واقعہ میں اصل مجرم کی جگہ غیر مجرم پکڑا گیا اور قانون کے مطابق حضورؐ نے اس کو سزا کا حکم بھی سنا دیا۔ لیکن بعد میں اصل مجرم نے آکر کہا کہ مجرم وہ نہیں۔ میں ہوں۔ اس پر آپ نے دونوں کی سزا معاف فرما دی ـــــــ پہلے کی اس لئے کہ وہ مجرم نہیں تھا، اور دوسرے کی یہ کہہ کر کہ اس نے ایک بے گناہ کو سزا سے بچانے کے لئے، اپنے آپ کو خود ہی سزا کے لئے پیش کر دیا۔ اس سے اس نے ایسی بلندیٔ کردار کا ثبوت دیا ہے کہ وہ معافی کا مستحق ہو گیا ہے۔ (نسائی) اس قسم کی اکثر مثالیں حضورؐ کے صادر فرمودہ فیصلوں میں ملتی ہیں۔ ایسے فیصلے کرتے وقت، قوم کے عمومی جذبات کا بھی خیال رکھا جاتا تھا۔ مثلاً حضرت ابراہیمؑ نے کعبہ تعمیر کیا تو حطیم اس کے اندر شامل تھا۔ جب قریش نے اس کی تعمیر نو کی تو حطیم باہر نکال دیا۔ رسول اللہؐ چاہتے تھے کہ حطیم کو کعبہ کے اندر شامل کر کے اسے ابراہیمیؑ خطوط کے مطابق تعمیر کر دیا جائے۔ لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ حضرت عائشہؓ کے استفسار پر آپؐ نے فرمایا کہ :-

> اگر تیری قوم نئی نئی کفر سے اسلام کی طرف نہ آئی ہوتی تو میں کعبہ کو منہدم کر کے اساسِ ابراہیمیؑ پر اس کی تعمیر کرتا۔ اور حطیم کو اس کے اندر شامل کر لیتا۔
> (مسلم باب نقض الکعبہ)

ان مثالوں سے واضح ہے کہ دین کے اصول و اقدار تو ہمیشہ غیر متبدل رہتے تھے لیکن ان کی روشنی میں مختلف امور کے فیصلے کرتے وقت مصالح عمومی، افراد کے احوال و کوائف اور قوم کے امیال و عواطف کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ اسی طرح، مختلف اوقات میں طریق کار کا بھی اختلاف ہوتا تھا۔ مثلاً عدل، قرآن کا بنیادی اصول ہے، جس میں کسی صورت میں بھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن عدل کو بروئے کار لانے کا طریقہ مختلف اوقات میں مختلف ہو گا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں :-

> شریعت سے اللہ کا مقصود بندوں میں عدل و انصاف کا قیام ہے۔ جس طریق کے ذریعے عدل و انصاف قائم کیا جائے گا، وہی دین ہو گا۔ اسے دین کے خلاف نہیں کہا جائے گا۔ (الطرق الحکمیہ)

لہٰذا، دین کے اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے جو طریق کار اختیار کیا جائے، اس کے لئے قرآن کی سند یا رسول اللہؐ سے نسبت ضروری نہیں۔ طریق کار حالات اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے رہیں گے۔ بشرطیکہ وہ طریق کار قرآنی اقدار سے نہ ٹکرائے۔ خود حضورؐ نے مختلف اوقات میں مختلف طریق کار اختیار فرمائے تھے۔

خلافتِ راشدہ

حضور نبی اکرم ؐ نے اسلامی مملکت کو قائم فرمایا اور عملاً بتا دیا کہ اس میں ثبات و تغیر کا امتزاج کس طرح سے ہوگا۔ اس کے بعد حضورؐ دنیا سے تشریف لے گئے اور مملکت کا نظام خلافتِ راشدہ کی تحویل میں آگیا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا زمانۂ خلافت بہت مختصر تھا۔ ان کے بعد، حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں مملکت کی حدود بہت پھیل گئیں۔ نئی نئی قومیں حلقۂ بگوشِ اسلام ہوئیں۔ مختلف تہذیبوں کے ساتھ واسطہ پڑا۔ متنوع انداز کے تمدن سامنے آئے۔ کاروبارِ مملکت وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ اس سے نئے مسائل ابھرے جن کا حل کرنا مملکت کا فریضہ تھا۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ:-

بے شک خدائے بزرگ و برتر، حالات اور زمانے کے تقاضوں سے لوگوں کیلئے نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ (کتاب المیزان)

ان نئے مسائل سے نمٹنے کے لئے ضروری تھا کہ نئے نئے فیصلے کئے جاتے۔ جو معاملات پہلی بار سامنے آئے اور ان کے متعلق جو فیصلے کئے گئے، انہیں مؤرخین نے "اوّلیاتِ عمرؓ" کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے اور ان کی فہرست طویل ہے۔ جن امور کے فیصلے، عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافتِ صدیقیؓ کے زمانے میں ہوئے تھے، حضرت عمرؓ نے، بدلے ہوئے حالات کے مطابق، ان میں بھی تغیر و تبدل کیا۔ یہی وہ گوشہ ہے جو ہمارے موضوعِ پیشِ نظر کی رو سے، قابلِ غور ہے۔ ایسے فیصلوں کی تعداد بھی کثیر ہے لیکن قلتِ وقت کی بنا پر، ان میں سے چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اس وقت میرا مقصود تاریخی استقصاء نہیں۔ مجھے صرف یہ دکھانا ہے کہ اسلامی نظام میں ناقابلِ تغیر، قرآنِ کریم کے اصول و اقدار ہوتے ہیں، اور ان کی روشنی میں جو فیصلے کئے جاتے ہیں، وہ حالات کے تغیر سے، بدلتے رہتے ہیں۔ نیز یہ کہ خود قرآنِ کریم کے احکام کا نفاذ بھی موقع اور محل کی رعایت سے، مناسب شرائط سے، ______ مشروط ہوتا ہے۔ وہ مثالیں جن کی طرف میں نے ابھی ابھی اشارہ کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے:-

حضرت عمرؓ کے فیصلے

(۱) قرآنِ کریم میں مسلمان مردوں کو، اہلِ کتاب کی عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافتِ صدیقیؓ میں اس کے مطابق عمل ہوتا رہا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر اسے روک دیا کہ مجھے خطرہ ہے کہ یہ عورتیں امت میں فتنہ برپا کرنے کا موجب بن جائیں گی۔

(احکام القرآن - ابوبکر جصاص - نیز کتاب الآثار، امام محمد)

(۲) - اسی طرح، قرآنِ کریم میں اہلِ کتاب کے طعام کو حلال قرار دیا گیا ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ مسلمانوں کے شہروں سے یہودیوں اور عیسائیوں کے ذبیحہ خانے ہٹا دیئے جائیں اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ ہم اپنے انتظام کی بنا پر ان سے مستغنی ہوگئے ہیں۔ (المدونہ - کتاب الذبائح)

(۳) ۔ قرآنِ کریم میں صدقات کے مال میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ رکھا گیا ہے ۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ جو لوگ، اپنے سابقہ معاشرہ سے کٹ کر، اسلامی معاشرہ میں داخل ہوں اور اس سے انہیں مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑے، تو اس مد سے ان کی امداد کی جائے۔ رسول اللہؐ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں اس پر عمل ہوتا رہا۔ لیکن حضرت فاروقِ اعظمؓ نے یہ کہہ کر اسے بند کر دیا کہ اب ملک میں ایسی خوشحالی پیدا ہو چکی ہے کہ کسی کو مالی مشکلات سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ اس لئے مؤلفۃ القلوب کیلئے الگ امداد کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔　　(احکام القرآن۔ جصاص)

(۴) رسول اللہؐ کے زمانے میں شرابی کو معمولی سی سزا دی جاتی تھی جس سے وہ اپنے کئے پر نادم ہو جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس کی سزا چالیس کوڑے مقرر کی اور حضرت عمرؓ نے اسے بڑھا کر اسی کوڑے کر دیا[1]۔　　(سنن الکبریٰ)

(۵) قرآنِ کریم کی رُو سے، سرقہ (چوری) کی سزا "قطع ید" ہے۔ لیکن حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانے میں اس سزا کو موقوف کر دیا۔ عام حالات میں بھی اگر کوئی شخص بھوک سے مجبور ہو کر اضطراری حالت میں چوری کر لیتا تو اسے سزا نہ دی جاتی۔ ایک شخص کے غلاموں نے کسی کا اونٹ چرا کر کھا لیا۔ تحقیق پر معلوم ہوا کہ ان کا مالک انہیں بھوکا رکھتا تھا جس کی وجہ سے انہوں نے مجبور ہو کر یہ اقدام کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے چوروں کو تو معاف کر دیا اور اونٹ کے مالک کو، ان غلاموں کے مالک سے یہ کہہ کر تاوان دلایا کہ اس جرم کے مرتکب درحقیقت تم ہو جس نے ان غلاموں کو بھوکے رکھ کر انہیں چوری کرنے پر مجبور کر دیا۔ (آپ کا یہ فیصلہ، اسلامی نظامِ معیشت میں بڑی اصولی اہمیت رکھتا ہے)۔

(۶) رسول اللہؐ کا فیصلہ تھا کہ کسی مسلمان کا مال اس کی رضامندی کے بغیر لیا نہیں جا سکتا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے میں، ایک شخص نے شکایت کی کہ اس کی زمین تک پانی اسی صورت میں پہنچ سکتا ہے کہ پانی کی نالی فلاں شخص کی زمین سے گزرے۔ اور وہ اس کے لئے رضامند نہیں ہوتا۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ وہ شخص اسے پانی لے جانے دے اور اس کے راستے میں بالکل مزاحم نہ ہو۔　　(الخراج لیحییٰ)

(۷) اس سلسلہ میں عہدِ فاروقیؓ کا سب سے اہم فیصلہ عراق اور شام کی مفتوحہ زمینوں کے متعلق ہے۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، زمین پر کسی کی ذاتی ملکیت جائز نہیں۔ اسے مملکت کی تحویل میں رہنا چاہیئے۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں اراضیات کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مسلمانوں کے قبضے میں آتے تھے جنہیں (مالِ غنیمت کے طور پر) بالعموم فوجیوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا، اگرچہ (جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں) ان کے متعلق رسول اللہؐ نے بھی مختلف انتظامی طریق اختیار فرمائے تھے۔ جب عراق اور

---

[1] کوڑے کس قسم کے ہوتے تھے اس کے متعلق طلوعِ اسلام بابت ستمبر ۱۹۷۸ء ملاحظہ فرمائیے۔

شام کے علاقے فتح ہوئے، تو ایک تو وہ رقبے بڑے وسیع و عریض تھے، اور دوسرے، وہاں کی زمینیں بڑی زرخیز تھیں۔ صحابہؓ کی اکثریت کی رائے تھی کہ انہیں، مالِ غنیمت کے طور پر، فوجیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن حضرت عمرؓ ان سے متفق نہیں تھے۔ یہ

عراق کی زمینیں

معاملہ اتنی اہمیت اختیار کر گیا کہ اسے اعیانِ اُمت کی عام میٹنگ میں پیش کرنا پڑا۔ اس میں مختلف حضرات نے جو تقاریر کیں، تاریخ کے اوراق نے انہیں اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے۔ اور وہ اس موضوع کے سمجھنے میں بڑی مفید ہیں۔ ان کے جواب میں حضرت عمرؓ نے فرمایا:۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس زمین کو آپ لوگوں میں تقسیم کر دوں اور بعد کے لوگوں کو ایسی حالت میں چھوڑ دوں کہ ان کا اس میں کچھ حصہ نہ رہے۔ کیا آپ کا یہ مقصد ہے کہ اس کی آمدنی ایک محدود طبقہ میں سمٹ کر رہ جائے، اور نسلاً بعد نسلٍ اسی میں منتقل ہوتی رہے؟ اگر میں نے ایسا کر دیا تو سرحدوں کی حفاظت کس مال سے کی جائے گی۔ بیواؤں اور حاجتمندوں کی کفالت کہاں سے ہو گی۔ مجھے اس کا بھی خدشہ ہے کہ لوگ پانی کی باریوں پر بھی فساد کرنے لگ جائیں گے۔

(لہٰذا، میں ان زمینوں کو مملکت کی تحویل میں رکھنا چاہتا ہوں۔ افراد میں تقسیم نہیں کرنا چاہتا)۔

پہلی میٹنگ میں فیصلہ نہ ہو سکا تو اسے دوسری میٹنگ میں زیرِ بحث لایا گیا۔ اس میں بھی بعض حضرات نے اپنے مؤقف کی تائید میں یہ دلیل پیش کی کہ رسول اللہؐ نے اراضیات کو فوجیوں میں تقسیم فرمایا تھا اس لئے ہمیں بھی ویسے ہی کرنا چاہیئے۔ اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے بڑی مبسوط اور مدلّل تقریر فرمائی۔ جس میں، علاوہ دیگر دلائل و شواہد، قرآن کریم کی اس آیت سے بھی استدلال فرمایا جس میں کہا گیا ہے کہ مالِ فَے میں مہاجرین اور انصار کا بھی حصہ ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَآءُوْا مِنْۢ بَعْدِهِمْ۔ (۵۹/۱۰) اور ان کے بعد آنے والے لوگوں کا بھی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر زمین کو افراد کی ذاتی ملکیت میں دے دیا جائے تو اس میں آنے والی نسلوں کا حصہ نہیں رہ سکتا اس لئے اسے مملکت کی تحویل ہی میں رہنا چاہیئے۔ یہ تقریر ایسی بصیرت افروز اور حقیقت کشا تھی کہ تمام صحابہؓ نے اس سے اتفاق کیا اور زمینیں مملکت کی تحویل میں رہیں۔ (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے، میری کتاب۔ شاہکارِ رسالتؐ۔ باب معاشی نظام)۔

ان تاریخی شواہد کے پیش کرنے سے میرا مقصد اس حقیقت کی وضاحت ہے کہ اگر حالات متقاضی ہوں تو اسلامی نظام کی رو سے، ایک اسلامی حکومت کے فیصلے، بعد میں آنے والی حکومت تبدیل بھی کر سکتی ہے اور ان میں حک و اضافہ بھی، بشرطیکہ یہ تبدیلیاں قرآن کے غیر متبدل اصول و اقدار سے ٹکرائیں نہیں۔

———(○)———

خلافتِ راشدہ کے بعد، اسلامی حکومت کا یہ نقشہ باقی نہ رہا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی نظام کا وہ اصول جس کا ذکر میں نے ابھی ابھی کیا ہے، اربابِ فکر و نظر کے سامنے نمایاں طور پر رہا۔ اس ضمن میں

امام ابو حنیفہؒ کا مسلک

ہمارے سامنے، ملّتِ اسلامیہ کے مقننِ اعظم، امام ابو حنیفہؒ کی مثال متمیز طور پر آتی ہے۔ جہاں تک اسلامی قوانین و ضوابط پر تفقہ و تدبّر کا تعلق ہے، امام صاحبؒ کا مقام بہت بلند ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فکر و تدبّر کی منفرد صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ آپ کا مسلک یہ تھا کہ دین کی اساس و بنیاد، قرآن کریم اور فکرِ انسانی پر ہے۔ جو کچھ قرآن کریم میں کہا گیا ہے، اس کی روشنی میں، اپنے زمانے کے مسائل کا حل، غور و تدبّر سے خود دریافت کرنا چاہیئے۔ اسے وہ اجتہاد یا تفقہ سے تعبیر کرتے تھے۔ جو لوگ آپ سے متفق نہیں تھے، وہ آپ کے اس مسلک کو قیاس قرار دے کر، اس کی مذمت کرتے تھے۔ اس حد تک مذمت کہ وہ آپ سے کہتے تھے کہ: اوّل من قاس ابلیس۔ فلا تقسس۔ سب سے پہلے جس نے قیاس سے کام لیا تھا وہ ابلیس تھا۔ لہٰذا، تم ایسا نہ کرو۔ اس کے جواب میں امام صاحبؒ فرماتے تھے کہ:-

> میں جو کچھ کہتا ہوں وہ قیاس نہیں۔ وہ تو قرآن کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ۔ (۶/۳۸) ہم نے کتاب میں کسی بات کو بھی چھوڑا نہیں۔ لہٰذا، جو کچھ میں کہتا ہوں وہ ان لوگوں کے نزدیک قیاس ہے جنہیں خدا نے فہم قرآن کی نعمت سے نہیں نوازا۔ (کتاب المیزان)

امام صاحبؒ اپنی عقل و فکر کی روشنی میں، قرآن کریم سے استنباطِ مسائل کرتے تھے، اور سابقہ ادوار کے فیصلوں کو، نظائر (PRECEDENTS) سے تعبیر کرتے تھے جن سے، معاملات کا فیصلہ کرنے میں، استفادہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ انہیں ہر زمانے میں من وعن نافذ کیا جائے۔ ان کے نزدیک، عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ کے فیصلوں کی بھی یہی حیثیت تھی۔ خطیب بغدادی نے اپنی تاریخ میں، بہت سی مثالیں درج کی ہیں جن سے امام صاحبؒ کا مسلک واضح ہو جاتا ہے۔ مثلاً یوسف بن اسباط سے ابو صالح الفرا نے یہ قول نقل کیا ہے کہ:-

> ابو حنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ نبی صلعم مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا (یعنی دونوں ہم عصر ہوتے) تو آپ میرے اکثر اقوال کو اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔ (بغدادی - جلد ۱۳ - صفحہ ۳۹۰)

دوسرے مقام پر ہے:-

> محمود بن موسیٰ کہتے ہیں کہ میں نے یوسف بن اسباط سے سنا کہ امام اعظمؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رسول اللہ مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا تو بہت سی باتوں میں یقیناً آپ میرے قول کو اختیار فرما لیتے۔ اور ابو اسحاق کو میں نے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابو حنیفہؒ کے سامنے

اکثر نبیؐ کی حدیثیں آتیں اور وہ ان کی مخالفت کرتے۔ (ایضاً۔ صـ ۲۸)

آپ کے اسی مسلک کی تشریح کرتے ہوئے بغدادی نے لکھا ہے کہ:۔

ابوعوانہ نے بیان کیا . . . کہ میں ایک روز ابوحنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے۔ ابوحنیفہؒ نے بلا کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابوحنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس آدمی کی مدد کو پہنچیے ورنہ امیر کے ہاں اس شخص کا ہاتھ کاٹ دیا جائے گا۔ ابوحنیفہؒ نے پھر بلا کسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گذر چکا اور ختم ہو چکا ہے۔ (ایضاً۔ صـ ۲۹)

امام صاحبؒ کے قول کا آخری ٹکڑا قابلِ غور ہے۔ اور اسی کی خاطر میں نے یہ اقتباس بھی پیش کیا ہے۔ آپ نے یہ نہیں کہا کہ مجھے شک ہے کہ رسول اللہؐ نے ایسا فیصلہ دیا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہؐ نے ایسا ہی ارشاد فرمایا ہوگا۔ لیکن وہ فیصلہ اس زمانے کے حالات کے مطابق تھا۔ اب حالات بدل چکے ہیں، اس لئے اب فیصلہ موجودہ حالات کے مطابق ہونا چاہیئے۔

علامہ اقبالؒ کا تبصرہ

امام ابوحنیفہؒ کا یہی مسلک تھا جس پر علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں بڑا بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ پہلے شاہ ولی اللہؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ:۔

پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم کو تیار کرتا ہے اور انہیں ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوعِ انسانی کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں، لیکن ان اصولوں کا نفاذ اُس قوم کی عادات و خصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رُو سے رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی، انہیں آنے والی نسلوں پر من و عن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔

(خطبات۔ تشکیلِ جدید۔ چھٹا خطبہ)

اس کے بعد علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں:۔

غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظمؒ ابوحنیفہ نے، جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے، اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے

کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنی فقہ کا مدار حدیث پر کیوں نہیں رکھا۔

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں :۔

ان حالات کی روشنی میں، میں سمجھتا ہوں کہ ان احادیث کے متعلق جن کی حیثیت قانونی ہے، امام ابوحنیفہؒ کا یہ طرزِ عمل بالکل معقول اور مناسب تھا۔ اور آج اگر کوئی وسیع النظر مفکر یہ کہتا ہے کہ احادیث ہمارے لئے من وعن شریعت کے احکام نہیں بن سکتیں تو اس کا یہ طرزِ عمل امام ابوحنیفہؒ کے طرزِ عمل کے ہم آہنگ ہوگا جن کا شمار فقہ اسلامی کے بلند ترین مفکرین میں ہوتا ہے۔ (خطبات۔ صفحہ ۱۶۴-۱۶۳)

یہ تھا امام ابوحنیفہؒ کا مسلک جو عہدِ رسالتمآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں رائج مسلک کے عین مطابق

اس کے خلاف تحریک

تھا۔ لیکن اس کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ایک تحریک اُبھری جس کی رُو سے یہ عقیدہ عام کیا گیا کہ جو کچھ پہلے زمانے میں ہو چکا ہے، اس میں سرِمُو تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ وہ عین دین ہے اور اس میں تغیر و تبدّل الحاد و بے دینی۔ جو کچھ سوچا جانا تھا، سوچا جا چکا۔ جو کچھ سمجھا جانا تھا، سمجھا جا چکا۔ اب غور و فکر (جسے اجتہاد کہتے ہیں) کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ شریعت کے جو احکام عہدِ رسالتمآبؐ میں نافذ ہو چکے تھے، وہ قیامت تک کے لئے غیر متبدل ہیں۔ ایک گروہ نے اس میں اتنا اضافہ کیا کہ ان میں وہ احکام بھی شامل ہیں جو خلافتِ راشدہ کے زمانے میں نافذ العمل تھے۔ چنانچہ ان احکام کے مجموعے مرتب کئے گئے اور وہ اُمت کے لئے دائماً، ناقابلِ تغیر و تبدّل، ضابطۂ قوانین قرار پا گئے۔ اس تحریک کے پُرجوش محرک امام شافعیؒ نظر آتے ہیں۔ انہی نے یہ عقیدہ عام کیا کہ وحی کی دو قسمیں ہیں —— ایک وحی متلو، اور دوسری وحی غیر متلو —— یہ دونوں، خدا کی طرف سے، بوساطتِ حضرت جبریلؑ نازل ہوئی تھیں۔ وحی متلو قرآن کے اندر درج کر دی گئی اور وحی غیر متلو، احادیث کہلائی۔ لہٰذا، رسول اللہؐ کو خدا کی طرف سے قرآن ہی نہیں دیا گیا۔ مثلہٗ معہٗ۔ قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل، دوسری وحی بھی دی گئی جو احادیث میں منضبط ہے۔ اس عقیدہ کی اہمیت کے پیشِ نظر، احادیث کے مختلف مجموعے مرتب کئے گئے، حالانکہ نہ رسول اللہؐ نے اپنی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب فرما کر اُمت کو دیا تھا اور نہ ہی خلافتِ راشدہ میں ایسا ہوا تھا۔ احادیث کا پہلا مبسوط مجموعہ، جسے صحیح ترین مجموعہ کہا جاتا ہے، امام بخاریؒ نے تیسری صدی ہجری میں مرتب کیا تھا۔ اور وہ بھی بغیر کسی سابقہ تحریری ریکارڈ کے، زبانی روایات کی بنا پر۔ احادیث کے تمام مجموعے اسی طرح مرتب ہوئے تھے۔ اس کے بعد یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ حدیث، قرآن پر قاضی ہے۔ یعنی اگر قرآن اور حدیث میں تضاد نظر آئے تو فیصلہ حدیث کی رو سے کیا جائے گا نہ کہ قرآن کی رو سے —— اور پھر ایک قدم اور آگے بڑھے تو یہ عقیدہ عام کیا گیا کہ حدیث، قرآن کو منسوخ بھی کر سکتی ہے۔

حدیث کی اِس پوزیشن کی رُو سے، جو کچھ احادیث کے مختلف مجموعوں میں آگیا (اور جسے صحیح قرار دے دیا گیا) وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل قرار پاگیا ـــــ یہی عقیدہ آج تک چلا آرہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس تحریک کا پہلا ہدف، امام ابوحنیفہؒ کو قرار پانا تھا جنہوں نے یہ مسلک پیش کیا تھا کہ وہ فیصلے، غیر متبدل احکامِ شریعت نہیں تھے۔ چنانچہ ان حضرات کی طرف سے امام صاحبؒ کے خلاف وہ کچھ کہا گیا جسے دہراتے ہوئے ہماری روح پر کپکپی چھا جاتی ہے۔ امام مالکؒ بن انس کہتے ہیں کہ ابوحنیفہؒ کا فتنہ اس امت کے لئے (معاذ اللہ) ابلیس کے فتنہ سے کم نہیں۔ عبدالرحمٰنؒ بن مہدی کہتے ہیں کہ میں نے دجال کے فتنہ کے بعد اسلام میں کسی فتنہ کو ابوحنیفہؒ کے فتنہ سے بڑا نہیں دیکھا۔ جب امام صاحبؒ کا انتقال ہوا تو امام اوزاعیؒ نے کہا کہ خدا کا شکر ہے کہ وہ اسلام کے ایک ایک دستہ کو توڑ رہا تھا۔ فزاری کہتے ہیں کہ میں نے سفیانؒ اور اوزاعیؒ دونوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ اسلام میں (معاذ اللہ) ابوحنیفہؒ سے زیادہ بدبخت پیدا نہیں ہوا۔ امام شافعیؒ نے بدترین کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ابراہیمؒ حربی کہتے ہیں کہ میں نے ایک روز ابوحنیفہؒ کے کچھ مسائل امام احمد بن حنبلؒ کے سامنے پیش کئے تو وہ تعجب کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابوحنیفہؒ ایک نیا اسلام تصنیف کر رہے ہیں۔ ان بزرگوں کے اس قسم کے فتاویٰ کی وجہ سے، امام صاحبؒ کے خلاف جذبۂ منافرت اس حد تک شدید ہو گیا کہ ابوعبیدؒ کہتے ہیں کہ میں اسود ابن سالم کے ساتھ رصافہ کی جامع مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہاں کسی مسئلہ کا تذکرہ آگیا۔ میرے منہ سے نکل گیا کہ ابوحنیفہؒ ایسا کہتے ہیں، تو اسود نے مجھے ڈانٹ دیا اور کہا کہ تو مسجد میں ابوحنیفہؒ کا تذکرہ کرتا ہے۔ مسجد میں ابوحنیفہؒ کا نام لینے کے جرم میں وہ مجھ سے اس قدر ناراض ہوئے کہ مرتے دم تک مجھ سے کلام نہیں کیا۔ (یہ تمام تصریحات خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد میں موجود ہیں اور ادارۂ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب، مقامِ حدیث میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے)۔

امام اعظمؒ کے مسلک کے متبعین نے کچھ وقت تک تو اس مخالفت کا مقابلہ کیا لیکن چونکہ مخالفین، لوگوں کو یہ کہہ کر بھڑکاتے تھے کہ یہ لوگ منکرینِ حدیث اور منکرینِ شانِ رسالت ہیں، اس لئے انہیں اس سیلابِ بے پناہ کے سامنے سپر انداز ہونا پڑا۔ اور اس عقیدہ کو تسلیم کرلیا کہ جو احکام احادیث میں ہیں، وہ ناقابلِ تغیر ہیں، اور پھر اپنی فقہ کے فیصلوں کی تائید، احادیث سے شروع کردی۔ یوں خود فقہ حنفی کے فیصلے غیر متبدل قرار پاگئے اور ان پر اجتہاد کے راستے بند ہونے شروع ہو گئے۔

اجتہاد کے دروازے بند

رفتہ رفتہ، یہ اس عقیدہ تک پہنچ گئے کہ (احادیث تو ایک طرف) جو کچھ ائمہ فقہ کہہ چکے ہیں وہ بھی قیامت تک ناقابلِ تغیر و تبدل ہے۔ چنانچہ فقہ حنفی کے ایک پیشوا اور مسلّم امام، ابوالحسن عبیداللہ الکرخی کا قول ہے کہ "ہر وہ آیت جو اس طریقہ کے مخالف ہو جس پر ہمارے اصحاب ہیں، وہ یا تو ماؤل ہے یا منسوخ۔ اسی طرح جو حدیث اس قسم کی ہو، وہ ماؤل یا منسوخ ہے۔" (تاریخ فقہ اسلامی۔ علامہ خضری۔ صـ ۲۴۲) ظاہر ہے

کہ ان حالات میں اجتہاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اجتہاد تو ایک طرف، یہ حضرات اب کسی مزید تحقیق و تفتیش کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے۔ چند سال ادھر کا ذکر ہے، (جامعہ اشرفیہ (لاہور) کے مفتی جمیل احمد تھانوی نے ایک استفسار کے جواب میں کہا تھا کہ:

> یہ طے شدہ بات ہے کہ تحقیق و تفتیش کا کام پہلی صدی، دوسری صدی اور تیسری صدی میں پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ اسی کا نام فقہِ اسلامی ہے جو ائمہ ہدیٰ کی تحقیقات کا مجموعہ ہے۔۔۔۔۔۔ لہٰذا، اگر تحقیقاتِ اسلامی سے ایسے مفہومات مراد ہوں جو مکمل اور تنقیح شدہ موجود ہیں، تو موجودہ دور کی تحقیق اگر اس کے مطابق ہے تو بلا ضرورت ہے اور اگر تحقیق اس کے خلاف ہے تو مردود ہے۔ اس پر اُمتِ محمدیہ کا اجماع ہے۔ (بحوالہ ایشیا - ۴ر اگست ۱۹۷۸ء)

حالانکہ ان کے سامنے، خود امامِ اعظمؒ کا یہ مسلک موجود ہے کہ وہ اپنے فیصلوں کو بھی ناقابلِ تغیر و تبدل قرار نہیں دیتے تھے۔ مزاحم بن زفر کہتے ہیں کہ میں نے امام ابوحنیفہؒ سے سوال کیا کہ جو کچھ آپ فتوے دیتے ہیں یا اپنی کتابوں میں درج فرماتے ہیں، کیا یہ سب حق ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ امام صاحبؒ نے فرمایا۔ بخدا مجھے معلوم نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ باطل ہو۔ اور اس کے باطل ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ امام زفرؒ فرماتے ہیں کہ ہم امام ابوحنیفہؒ کے پاس آیا جایا کرتے تھے۔ جو کچھ امام صاحبؒ فیصلے فرماتے ہم انہیں لکھ لیا کرتے تھے۔ ایک دن امام صاحبؒ نے ابو یوسف سے فرمایا۔ کہ یعقوب! تیرا ناس ہو۔ جو کچھ تو مجھ سے سنتا ہے، اسے سب کا سب نہ لکھ لیا کر۔ آج میری رائے کچھ ہوتی ہے اور کل میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ ابو نعیم کہتے ہیں کہ میں نے ابوحنیفہؒ کو ابو یوسف سے یہ فرماتے ہوئے سنا کہ مجھ سے کوئی مسئلہ نقل نہ کرو۔ کیونکہ بخدا مجھے خبر نہیں کہ میں اپنے اجتہاد میں خطاکار ہوں یا مصیب۔ (خطیب بغدادی۔ جلد ۱۴۔ صـ ۳۵۲) یہ تھا امام صاحبؒ کا مسلک خود اپنی فقہ کے متعلق۔ یہی وجہ ہے کہ جسے فقہ حنفی کہتے ہیں، اس میں امام صاحبؒ کی کوئی کتاب شامل نہیں۔ انہوں نے فقہ کی کوئی تصنیف اپنے پیچھے نہیں چھوڑی تھی۔

بہرحال، میں کہہ یہ رہا تھا کہ جس فقہ کو خود اس فقہ کے بانی، امام ابوحنیفہؒ ناقابلِ تغیر قرار نہیں دیتے تھے، ان کے نام لیواؤں نے اسے قیامت تک کے لئے غیر متبدل قرار دے لیا۔ اور اس طرح اُمت پر اجتہاد کے تمام دروازے مستقلاً بند ہو گئے۔ یہ کیفیت صدیوں سے مسلسل چلی آ رہی ہے۔

عقل و فکر مفلوج ہو گئے

نتیجہ اس کا یہ کہ عقل و فکر کی تمام صلاحیتیں، جنہیں قرآن کریم نے وجہ شرفِ انسانیت قرار دیا ہے، پہلے شل اور پھر رفتہ رفتہ مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ مسلمان اصولی طور پر دو فرقوں میں منقسم ہیں۔ ایک اہلِ حدیث اور دوسرے اہلِ فقہ۔ اہلِ حدیث کے نزدیک، علمِ دین سے مراد فقط اتنا رہ گیا ہے کہ جو بات سامنے آئے، یہ بتا دیا جائے کہ اس کے بارے میں کتبِ روایات میں کیا آیا ہے۔ اور اہلِ فقہ کے

نزدیک یہ کہ اس کے متعلق ائمۂ فقہ نے کیا ارشاد فرمایا ہے۔ جو شخص جتنے زیادہ حوالے پیش کر سکے وہ اتنا ہی بڑا عالم تصوّر کیا جائے گا۔ اسلامی زندگی سے مقصود یہ قرار پایا کہ قدم بقدم اسلاف کے راستے پر چلا جائے۔ کسی نے اس سے سرِمو انحراف یا تجاوز کیا اور ارباب شریعت کی بارگاہوں سے کفر و الحاد کے فتوؤں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ اسلاف کی تقلید میں کس درجہ شدت اختیار کی گئی' اس کا اندازہ ایک تاریخی واقعہ سے لگائیے۔ اموی دورِ حکومت میں، دمشق میں سب سے بڑی جامع مسجد تعمیر ہوئی اور اس کے بعد دیگر مساجد اس کے رخ پر بنائی گئیں۔ کچھ عرصہ بعد، مسلمان انجینئروں نے حسابی قاعدہ

تقلید کی شدّت

کی رو سے دیکھا کہ جامع دمشق کا رخ کعبہ کی صحیح سمت نہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس مسجد میں صفوں کا رخ بدل دیا جائے اور آئندہ مساجد صحیح سمت کے مطابق تعمیر کی جائیں۔ مسئلہ اربابِ شریعت کے سامنے پیش ہوا۔ انہوں نے لمبی چوڑی بحث و تمحیص کے بعد یہ فیصلہ صادر فرمایا کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ جامع دمشق کا رُخ جانبِ قبلہ نہیں تو اس سے یہ ماننا پڑے گا کہ ہمارے اسلاف نے جس قدر نمازیں پڑھیں وہ درست نہیں تھیں۔ ہم چند انجینئروں کی بات پر، اپنے اسلاف کی شان میں اس قدر سوءِ ادبی کے مرتکب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ان مساجد کا رخ تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ صحیح وہی ہے جو اسلاف کرتے چلے آئے ہیں اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر چلیں گے۔ کل خیر فی اتباع السلف۔ نیکی اور بھلائی بہ تمام و کمال اسلاف کے اتباع میں ہے۔ (بحوالہ شاطبی) چنانچہ مساجد کا رخ نہیں بدلا گیا ــــــ اور یہ مسلک اور عقیدہ اس قوم کا ہے جس کا خدا، کفار کے متعلق کہتا ہے کہ جب ان کے سامنے حقائق پیش کئے جائیں تو بجائے اس کے کہ یہ ان پر عقل و فکر کی روشنی میں غور کریں' اور دلائل و براہین کی رُو سے ان کے متعلق بحث و تمحیص کریں، یہ اتنا کہہ کر ان حقائق سے انکار

تقلید اور قرآن

کر دیتے ہیں کہ: إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّهْتَدُونَ۔ (۴۳/۲۲) ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ایک راستے پر چلتے پایا اور ہم انہیں کے نقوشِ قدم پر چلتے جائیں گے۔ اس لئے ہم کوئی ایسی بات سننا بھی نہیں چاہتے جو ہمیں اسلاف کے راستے سے دوسری طرف لے جانے کا موجب بنے۔ دوسرے مقام پر ہے۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ قرآن کی پیروی کرو تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو اس راستے پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے پایا ہے ــــــ اس پر قرآن کہتا ہے کہ: أَوَلَوْ كَانَ الشَّيْطَانُ يَدْعُوهُمْ إِلَىٰ عَذَابِ السَّعِيرِ۔ (۳۱/۲۱) خواہ شیطان انہیں جہنّم کی دعوت ہی کیوں نہ دے، یہ اسی راستے پر چلتے جائیں گے۔

اس کے جواب میں ہمارے اربابِ شریعت کہہ دیا کرتے ہیں کہ کفار کے اسلاف چونکہ غلط راستے پر چلتے تھے اس لئے ان کی تقلید ناجائز تھی۔ ہمارے اسلاف صحیح راستے پر چلتے تھے اس لئے ان کی تقلید ناجائز

نہیں قرار پا سکتی۔ ایسا کہتے وقت وہ اس علّت پر غور نہیں کرتے جس کی بنا پر تقلیدِ اسلاف سے روکا گیا ہے، وہ علت یہ ہے کہ خدا جب مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ کے اتباع کا حکم دیتا ہے تو اس لئے کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ کی راہنمائی غیر متبدل ہونے کی وجہ سے ہر زمانے میں واجب الاتباع ہوتی ہے، اور اسلاف کا مسلک، خواہ ان کے زمانے میں صحیح بھی کیوں نہ ہو، ہر زمانے میں اتباع کے قابل نہیں ہوتا۔ اس لئے ابدی پیروی کتاب اللہ کی ہوگی، نہ کہ کسی سابقہ زمانے کی روش کی۔ حضور نبی اکرمؐ کا یہ ارشادِ گرامی اس باب میں قندیلِ ہدایت ہے، آپ نے فرمایا:-

النّاس اشبہ بزمانھم من اسلافھم۔　　(جاحظ۔ البیان والتبیین)

لوگ، اپنے اسلاف کے مقابلہ میں، اپنے زمانے کے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔

دین میں اس قدر جمود و تقلید کی بنیادی وجہ یہ بھی ہوئی کہ ہماری حکومتیں اسلامی نہ رہیں۔ اس سے زندگی میں ثنویت .... پیدا ہوگئی۔ دنیاوی امور حکومت نے اپنے ذمے لے لئے اور شرعی امور (جن سے مراد شخصی قوانین تھے)...

جمود کی دوسری وجہ

ارباب شریعت کے حیطۂ اقتدار میں چلے گئے۔ سلطنتیں اپنے دائرۂ اختیار میں، قوانین میں ردّ و بدل کرتی رہیں۔ لیکن اربابِ شریعت نے اسی میں عافیت دیکھی کہ جو کچھ ہوتا چلا آیا ہے وہ اسی کی پابندی کرتے رہیں۔ اس کے لئے عقیدہ یہ وضع کر لیا گیا کہ ہر آنے والا زمانہ، سابقہ زمانے کے مقابلے میں، زہد و تقویٰ ہی میں نہیں، علم و بصیرت میں بھی پست تر اور خراب تر ہوتا ہے۔ علامہ اسلم جیراجپوریؒ سنایا کرتے تھے کہ اثنائے حج میں انہوں نے

ماضی درخشندہ حال تاریک

دیکھا کہ مکہ کا ایک نجدی نانبائی، پکار پکار کر کہا کرتا کہ آج کی روٹی دو پیسے میں۔ کل کی (باسی) روٹی ایک آنہ میں۔ انہوں نے ایک دن اس سے پوچھا کہ یہ کیا بات ہے کہ تم آج کی تازہ روٹی دو پیسے میں بیچتے ہو اور کل کی باسی ایک آنہ میں۔ کہنے لگا کہ کل کی روٹی، رسول اللہؐ کے زمانہ سے ایک دن قریب تر ہے۔ اس لئے قیمت میں گراں تر۔ یہ ذہنیت اگر انفرادی جذبات کی حد تک رہتی تو پھر بھی اس میں چنداں مضائقہ نہ تھا۔ لیکن اس نے اصولِ دین کی شکل اختیار کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُمت کو اپنا ماضی روشن دکھائی دیا، حال تاریک، اور مستقبل تاریک تر۔

علامہ اقبالؒ نے جب مسلمانوں کی اس صورتِ حال پر غور کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اس کی بنیادی وجہ، مسلمانوں کی کسی مملکت کا بھی اسلامی نہ ہونا ہے۔ اگر کسی ایسی مملکت کا قیام عمل میں آجائے جس میں صحیح قرآنی نظام نافذ ہو، تو اسلام از سر نو زندہ ہو سکتا ہے۔ ان کے نزدیک، اس اسلام کا تصور کیا تھا جسے وہ اس طرح زندہ کرنا چاہتے تھے، اس کے متعلق انہوں نے اپنے خطبات، تشکیلِ جدید کے چھٹے خطبہ میں

علامہ اقبالؒ کا تصورِ اسلام

تفصیل سے بحث کی ہے۔ جس کا عنوان ہے ـــــــ اسلامی قانونِ شریعت میں اصولِ ارتقاء ـــــــ اس میں انہوں نے کہا ہے:-

اسلام کا پیش کردہ تصوّر یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس تو ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیرات کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصوّر پر متشکل ہو، اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل و تغیر پذیر عناصر میں موافقت پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے، ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن اگر ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں ——— وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے ——— تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقعہ ہوئی ہے، یکسر جامد اور متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی زندگی میں بوناکامی ہوئی، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس، گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔

یہ تصوّر انہوں نے سنہ ۲۹-۱۹۲۸ء میں پیش کیا اور اس کے بعد، سنہ ۱۹۳۰ء میں، الٰہ آباد کے خطبہ میں انہوں نے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد مملکت کے مطالبہ کی بنیاد رکھ دی ——— قائدِ اعظمؒ نے جب اس مطالبہ کو اپنایا تو ان کے پیشِ نظر بھی اسلامی نظام کا یہی تصوّر تھا۔ میں نے قائدِ اعظمؒ کے ساتھ اپنے تعلقات کا کبھی چرچا نہیں کیا اس لئے کہ اس سے (بالخصوص ان کی وفات کے بعد)

قائدِ اعظمؒ

خود ستائی اور خود خویشی کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن، میں اتنا عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ اس موضوع پر ان سے میری اکثر گفتگو رہتی تھی ——— (بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ ان سے میرے تعلقات کی بنیاد ہی یہ تھی)۔ اسلامی نظام کا یہ تصوّر ان کے ذہن میں بھی بالکل صاف تھا اور اس کی طرف انہوں نے کئی بار اپنی تقاریر اور بیانات میں اشارہ بھی کیا تھا۔ اس سلسلہ میں، ان کا وہ بیان جو انہوں نے حیدر آباد (دکن) کے طلبا کے سوال کے جواب میں دیا تھا، ایسا واضح ہے کہ اس کی روشنی میں، اس باب میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ انہوں نے اس سوال کے جواب میں کہ اسلامی مملکت، جس کے لئے مطالبۂ پاکستان پیش کیا جا رہا ہے، کی امتیازی خصوصیت کیا ہے، فرمایا تھا:۔

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت صرف خدا کی ہوتی ہے جس کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ مجید کے احکام

ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔

علامہ اقبالؒ تو حصولِ پاکستان سے پہلے ہی عالمِ بالا کو تشریف لے گئے اور قائداعظمؒ یوں کہئے کہ ہنوز آئینِ پاکستان کی پہلی اینٹ بھی رکھنے نہ پائے تھے کہ ہم سے رخصت ہو گئے۔ ان کے بعد، یہاں اسلامی نظام قائم کرنے کی ذمہ داری ان حضرات نے اپنے ہاتھ میں لے لی، جن کے سامنے اسلام کا وہی جامد تصوّر تھا جس کی جگہ حقیقی اسلام کے احیاء کے لئے پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔

پاکستان میں کشمکش

جیسا کہ میں نے شروع میں بیان کیا ہے، جب منیر انکوائری کمیٹی کے سامنے، حضرات علمائے کرام پیش ہوتے ہیں تو انہوں نے کہا تھا کہ پاکستان میں نہ قانون سازی کی ضرورت ہے اور نہ ہی مجالسِ قانون ساز کی حاجت۔ ہمارے پاس مکمل ضابطۂ قوانین بنا بنایا موجود ہے۔ حکومت کا کام فقط اتنا ہے کہ اس ضابطہ کو ملک میں نافذ کر دے۔ اور اگر کسی باب میں انہیں کوئی دشواری پیش آئے تو اس کی بابت ہم سے پوچھ لے ——— دوسری طرف، اربابِ نظم و نسق کو اس کا احساس تھا کہ جس فقہی ضابطہ کو یہ حضرات یہاں نافذ کرانا چاہتے ہیں، وہ آج سے صدیوں پہلے کے حالات کے مطابق مرتب ہوا تھا۔ اور موجودہ زمانے کے بدلے ہوئے حالات کے پیشِ نظر وہ ممکن العمل نہیں رہا ——— یہ حضرات ان دشواریوں کو جانتے تھے لیکن ان میں سے کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ کھل کر کہے کہ یہ ضابطہ دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہم اپنے زمانے کے حالات کے مطابق خود قوانین وضع کریں گے ——— چنانچہ وہ بھی اس اصطلاح کی آڑ میں اس سوال کو ٹالتے رہے کہ پاکستان میں کوئی قانون کتاب و سنّت کے خلاف نہیں ہوگا۔

یہ ہے وہ گرداب جس میں مملکت کی کشتی تیس[1] سال سے پھنسی ہوئی ہے اور حساس قلوب کی ہزار تپش و خلش کے باوجود، ایک انچ بھی ساحلِ مراد کی طرف نہیں بڑھی۔ پھر مشکل یہ ہے کہ یہ سوال قانون سازی تک ہی محدود نہیں، قدامت پرست طبقہ کا تقاضا ہے کہ اسلاف کا اتباع زندگی کے ہر شعبے میں ضروری ہے ——— وضع قطع، تراش خراش، رہن سہن، نشست و برخاست، خورد و نوش، حتیٰ کہ فکر و خیال تک میں ان کی عائد کردہ حدود و قیود کی پابندی لازمی ہے ——— زمانے کا سورج، ہر نئی صبح، نئی دنیائیں اپنے جلو میں لاتا ہے، لیکن ان حضرات کا ارشاد ہے کہ کسی نئی بات کے متعلق ذہن میں خیال تک لانا بھی حرام ہے۔ ان کا یہ اعلان ہر خطبہ میں، ہر محراب و منبر سے ہر کان میں مسلسل ڈالا جاتا ہے کہ:۔

---

[1] اب تیس سال سے۔

كلّ بدعة ضلالة ۔ وكل ضلالة فى النار

ہر نئی بات گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنّم میں لے جانے کا موجب۔

اور یہ ہے جدید وقدیم کی وہ کشمکش جس میں ہماری نئی نسل اس بری طرح سے گرفتار ہے۔ اس صورتِ حال سے کچھ ہم ہی دوچار نہیں ہوئے دنیا کی ہر "مذہب پرست" قوم کو اس سے واسطہ پڑا ہے۔ لیکن ان کے ہاں اس کا علاج آسان تھا۔ انہوں نے مذہب کو گرجوں اور مندروں میں بند کیا اور زندگی کے معاملات میں پوری پوری آزادی حاصل کرلی لیکن اسلام کی کیفیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ افراد کا ذاتی اور پرائیویٹ معاملہ نہیں۔ یہ وہ نظامِ حیات ہے جو اُمّت کی اجتماعی زندگی کے تمام گوشوں کو محیط اور اُن کی مملکت کا بنیادی آئین اور دستور ہے جو ابدالآباد تک قائم و دائم رہے گا۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے نظام کا تقاضا ہے کہ اس میں اجتہاد کا دروازہ کھلا رہے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمیں ڈر ہے کہ ـــــ یہاں بھی وہی حالت ہوجائے گی جو یورپ (یا دیگر مذہب پرست ممالک) میں ہوئی ہے۔ مذہب کو مساجد کے حجروں میں محبوس کردیا جائے گا اور مملکت لادین ہوجائے گی ـــــ یعنی وہ وحی کے ابدی اصول و اقدار کو بھی چھوڑ دے گی ـــــ اور یہ ہماری ہی نہیں، نوعِ انسانی کی انتہائی بدقسمتی ہوگی۔

اس کشمکش کو آپ قدیم وجدید کی آویزش یا دین اور مذہب کی کشاکش کہہ لیجئے، لیکن اس باب میں خود مذہب پرست طبقہ (قدیم) کے اندر جو باہمی کشمکش ہے وہ اس سے بھی کہیں زیادہ شدید ہے۔ یہاں اسلام کا اس قسم کا نقشہ قائم کرنے کی تجویز یا کوشش کی جارہی ہے کہ پرسنل لاز کی حد تک ہر فرقہ کو اپنی اپنی فقہ پر عمل کرنے کی اجازت ہو لیکن پبلک لاز فقہ حنفی کے نافذ کئے جائیں کیونکہ اس فقہ کے پیرؤں کی یہاں اکثریت ہے۔ اس کے خلاف غیر حنفی فرقے (سنّی اور شیعہ دونوں) احتجاج کر رہے ہیں کیونکہ وہ فقہ حنفی کو کتاب وسنت کی صحیح تعبیر تسلیم ہی نہیں کرتے۔ (اس کی مزید تشریح میں ذرا آگے چل کر پیشِ خدمت کروں گا)۔

یہ ہے وہ کشمکش جس میں یہ بدقسمت ملک اس وقت بُری طرح اُلجھا ہوا ہے اور جس کا نتیجہ بڑا تباہ کن ہوسکتا ہے۔ اگر ملک میں کوئی ایسا طبقہ موجود ہے جو اس ملک کو تباہی سے بچانے کا احساس اور درد اپنے سینے میں رکھتا ہے تو اس کے لئے فی الواقعہ ـــــ یہ گھڑی محشر کی ہے ـــــ اس طبقہ کو بہت بڑا جہاد کرنا پڑے گا۔ اور اس کے لئے سب سے پہلے وہ کچھ سننا پڑے گا جو امام ابوحنیفہؒ نے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے سنا تھا اور جو خود مجھے تئیس (اب کبیس) سال سے سننا پڑ رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ اس طبقہ کے لئے یہ بشارت بھی ہے کہ اگر وہ اس خطۂ پاک میں حقیقی اسلام کے احیاء میں کامیاب ہوگئے تو پھر وہ دین، مملکتِ پاکستان میں ہی قائم نہیں ہوگا، اس کے عالمگیر ہوجانے کے راستے بھی ہموار ہوجائیں گے۔

دین الحق کے معنی

قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ دین الحق، تمام ادیانِ عالم پر غالب آسکتا ہے، تو اس میں الحق کی خصوصیت کا سمجھ

لینا نہایت ضروری ہے۔ عربی زبان میں حق اسے کہتے ہیں جو اپنے مقام پر محکم اور اٹل بھی ہو، اور اس کے ساتھ ہی، عندالضرورت متحرک بھی۔ عرب کس مقام پر حق کا لفظ بولتے تھے، اسے سمجھ لیا جائے تو دین الحق کی بنیادی خصوصیت سامنے آجاتی ہے۔ آج کل ہمارے دروازوں میں قبضے (HINGES) لگے ہوتے ہیں لیکن پہلے زمانے میں دروازے کی چُول، ساکٹ (SOCKET) میں فٹ کی جاتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دروازہ اپنے مقام پر محکم بھی رہتا تھا اور ضرورت کے مطابق کھلتا اور بند بھی ہوتا تھا۔ اس طریقِ عمل کو وہ لوگ حق سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ امام راغب حق کے معنی مطابقت اور موافقت کرتے ہیں۔ دین وہی الحق ہو سکتا ہے جس کی کیفیت دروازے کی طرح ہو کہ حفاظت کے لئے وہ محکم طور پر بند بھی ہو سکے اور آنے جانے کے لئے کھل بھی سکے۔ اگر دروازہ مستقل طور پر بند رہے تو اسے دروازہ نہیں کہا جائے گا۔ اس کی حیثیت جامد دیوار کی سی ہو جائے گی۔ اور اگر وہ ہمیشہ کھلا ہی رہے، بند نہ ہو سکے تو اس میں اور کھلے میدان میں کوئی فرق نہیں رہے گا.....

دروازہ، جب تک، حالات کے مطابق، کھلتا اور بند ہوتا رہتا ہے، دین کہلاتا ہے۔ جب وہ ایک جگہ جامد ہو جاتا ہے، مذہب بن جاتا ہے۔ اور جب چوپٹ کھلا رہے تو سیکولر نظام کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ لہٰذا، جو لوگ اسلام کو بہ حیثیت دین الحق زندہ کرنے کے متمنی ہیں، ان کے لئے ضروری ہو گا کہ وہ اسے دروازے کی حیثیت سے از سرِ نو قائم کریں۔ یعنی ایسا نظام قائم کریں جس میں:-

۱- قرآن کریم کے ابدی اور غیر متبدل اصول و اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، جزئی احکام اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق، باہمی مشاورت سے خود مرتب کئے جائیں۔ قرآنی اصول و اقدار تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں اور ان کی روشنی میں مرتب کردہ احکام میں عندالضرورت تغیر و تبدل اور حک و اضافہ ہوتا رہے۔ ان قوانین کی تدوین کے سلسلہ میں، ان احکام و ضوابط سے استفادہ کیا جائے جو اس سے پہلے مختلف زمانوں میں مرتب ہوتے رہے ہیں۔

۲- قرآنی احکام کو نافذ کرتے ہوئے، موقع و محل، احوال و کوائف، قوم اور افراد کی ذہنی اور نفسیاتی سطح اور اپنے زمانے کے عام تمدنی، معاشرتی اور معاشی حالات کو سامنے رکھا جائے۔

۳- قرآن کریم نے جس قرآنی معاشرہ کو منتہیٰ و مقصود قرار دیا ہے، اسے بطور نصب العین سامنے رکھا جائے، اور پھر یہ دیکھا جائے کہ ہم کس مقام پر کھڑے ہیں۔ وہاں سے بتدریج اُس نصب العین کی طرف آہستہ آہستہ بڑھا جائے۔

۴- نبی اکرمؐ کی جس سیرتِ طیبہ کو اسوۂ حسنہ قرار دیا گیا ہے اس کے نمایاں خط و خال قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ اسے سیرت و کردار کا معیار قرار دیا جائے اور دیکھا جائے کہ قوم، انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے کس حد تک اس معیار پر پوری اترتی ہے۔

۵- نظامِ تعلیم ایسا مرتب کیا جائے جس سے ایک طرف، طلباء میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ

دنیا کا کوئی معاملہ سامنے آئے، انہیں معلوم ہو کہ قرآن کریم اس باب میں کیا راہ نمائی دیتا ہے، اور دوسری طرف، ان میں ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا ہو کہ قرآنی اصول و اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آرزو ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرے۔ اور

۶۔ مملکت میں ایک ادارہ ایسا ہو (مثلاً سپریم کورٹ) جو اس بات پر نگاہ رکھے کہ مملکت کا کوئی قدم قرآنی اصول و اقدار کے خلاف نہ اٹھے۔

ایسے نظام کے قیام کی مخالفت، دنیا کے ہر فرعون، ہامان اور قارون کی طرف سے ہوگی۔ یعنی ان اربابِ سیاست کی طرف سے جو سیکولر حکومت قائم کرنے کے خواہاں ہوں۔ ان کے علاوہ قدامت پرست طبقے کی طرف سے اور نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کی طرف سے بھی اس مخالفت میں "خدا اور رسول" کے نام کو سب سے پہلے بطورِ حربہ استعمال کیا جائے گا تاکہ عوام کے جذبات کو مشتعل کرنے میں آسانی رہے۔ لہٰذا، اس نظام کے قیام کے لئے، مومنانہ فراست کے ساتھ، قلندرانہ عزم اور بے باکانہ جراٴت کی ضرورت ہوگی۔ یہ تھی وہ حقیقت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ:۔

> یہ سوال کہ اسلامی قوانینِ شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں، بڑا اہم ہے اور بہت بڑی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً ہاں میں ہونا چاہیئے۔ بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی رُوح کو لے کر آگے بڑھے ــــــ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جراٴت ہوئی کہ:۔
>
> حَسْبُنَا كِتَابُ اللهِ
>
> ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ (خطباتِ اقبالؒ)

جس قوم اور جس ملک میں یہ روحِ عمریؓ ابھری، اسلامی نظام اسی میں قائم ہو سکے گا ــــــ باقی رہا مذہب، وہ خواہ عیسائیوں کا ہو یا یہودیوں کا، ہندوؤں کا ہو یا مسلمانوں کا ــــــ اس کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ اب تدبر کی فسوں سازیاں یا تقدس کی سحرکاریاں، اسے زمانے کے تھپیڑوں سے بچا نہیں سکتیں۔ دین حق ہوتا ہے اور مذہب باطل ــــــ وَ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ــــــ باطل کو بہرحال میدان چھوڑنا ہوتا ہے۔ یہ خدا کا فیصلہ ہے اور اس کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ سُنَّةَ اللهِ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللهِ تَبْدِيلًا ــــــ لیکن مذہب جاتے جاتے بھی، اپنی حرکتِ مذبوحی یا رقصِ بسمل سے جو تماشا مچاتا ہے، اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ جیسا کہ میں نے ذرا پہلے مجملاً بتایا ہے، تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد یہاں مطالبہ شروع کر دیا گیا کہ چونکہ یہ مملکت اسلام کے نام پر حاصل کی گئی ہے اس لئے یہاں اسلامی نظام نافذ اور اسلامی قوانین رائج ہوں گے۔ میں نے کہا کہ اس مطالبہ کو مجمل نہ رکھیے۔ اس کی ذرا تشریح کیجئے۔ تو اس تشریح کی رُو سے کہا گیا کہ یہاں "کتاب و سنّت"

کے مطابق قوانین رائج ہوں گے۔ میں نے کہا کہ "کتاب و سنت" کی رُو سے کوئی ایسا مجموعۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جس کا اطلاق تمام فرقوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔ اس لئے اس اصول کے مطابق یہاں اسلامی نظام کبھی قائم نہیں ہو سکے گا۔ مذہب پرست طبقہ کے پاس اس اعتراض کا جواب گالیوں کے سوا کچھ نہیں تھا ——— یہ منکرِ حدیث ہے، منکرِ شانِ رسالت ہے، ملحد ہے، بے دین ہے حتیٰ کہ کافر ہے ——— تیئیس برس کی مسلسل گالیوں کے بعد، جماعتِ اسلامی (جو اس مخالفت میں سب سے آگے تھی) کے امیر، سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب، کو یہ اعتراف اور اعلان کرنا پڑا کہ پبلک لاز کے معاملہ میں:۔

کتاب و سنت کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔
(ایشیا۔ ۲۳ر اگست سنہ ۱۹۷۸ء)

لہٰذا، پرسنل لاز کی حد تک تو مختلف فرقوں کو اجازت ہوگی کہ وہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق عمل کریں لیکن پبلک لاز کے لئے فقہ حنفی کو رائج کیا جائے گا جو یہاں کی اکثریت کی فقہ ہے۔ اہلِ حدیث فرقہ کی طرف سے اس تجویز کی پہلے ہی سخت مخالفت ہو چکی ہے، اب شیعہ حضرات کی طرف سے اس کے خلاف شدید احتجاج کیا جا رہا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ کسی فرقے کو اس کا کیا حق حاصل ہے کہ جس فقہ کو ہم اسلامی تسلیم نہیں کرتے، اسے ہم سے، بطورِ قوانینِ شریعت، زبردستی منوایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں یہاں تک کہہ دیا ہے کہ:۔

اگر سوادِ اعظم کے راہ نماؤں نے ہماری معروضات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور اپنے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہ کی تو ہم اس ملک اور اپنے مستقبل کے بارے میں نئے انداز سے سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے خواہ ایک ناگوار فرض کی حیثیت سے ہی سہی۔
(پمفلٹ ——— آئینِ پاکستان اور مسلمہ اسلامی فرقے ——— شائع کردہ سید محمد رضا رضوی، کنوینر، ادارۂ فلاحِ ملتِ پاکستان۔ حیدر آباد)

جب یہاں یہ صورتِ حال پیدا ہوئی اور ملک خانہ جنگی کا اکھاڑہ بنا تو اس سے بچنے کی اس کے سوا کوئی شکل نظر نہیں آئے گی کہ یہاں سیکولر نظامِ حکومت رائج کیا جائے۔ اور اگر یہاں سیکولر نظام رائج کر دیا گیا تو اس کا منطقی نتیجہ یہ مطالبہ ہوگا کہ اب پاکستان کو ہندوستان سے الگ رکھنے کی ضرورت کیا ہے۔ دو قومی نظریہ یہاں پہلے سے ختم ہو چکا ہے کیونکہ یہاں غیر مسلموں کو ایک الگ قوم قرار نہیں دیا گیا۔ اور

۱؎ اس کی تفصیل کے لئے وہ مقالہ دیکھئے جو طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت اکتوبر سنہ ۱۹۷۶ء میں شائع کیا گیا تھا اور اس کا پمفلٹ بھی چھپ چکا تھا۔ اس کا عنوان ہے ——— "اسلامی مملکت کا خواب جو کثرتِ تعبیر سے پریشان ہو گیا" ——— اس کے بعد (سنہ ۷۷-۱۹۷۶ء میں) اس موضوع پر کئی ایک اور پمفلٹ بھی شائع کئے گئے ہیں۔

نظامِ حکومت یہاں سیکولر ہے۔ اس سے وہ بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے جس پر مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کے مطالبہ کی عمارت استوار ہوئی تھی۔ اور جب وہ بنیاد ہی ختم ہو چکی ہے تو اسے الگ مملکت رکھ کر ہندوستان کے ساتھ جنگ کا مسلسل خطرہ برقرار رکھنا کہاں کی دانشمندی ہے؟ ہماری نئی نسل کے دل میں ——— جسے اسلام کی حقیقی تعلیم سے یکسر بیگانہ رکھا گیا ہے ——— یہ خیالات ابھریں گے اور اس کا جو نتیجہ ہوگا، اُسے زبان تک لانے کی کم از کم میں تو اپنے اندر ہمت نہیں پاتا...... مملکتِ پاکستان کو ان خانہ جنگیوں اور آخرالامر تباہی سے بچانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ مملکت کا قانونی ضابطہ اس طرح مرتب کیا جائے کہ قرآن مجید کو اساس اور بنیاد اور آخری معیار قرار دے کر، مختلف فرقوں کے فقہی ضوابط کو سامنے رکھ لیا جائے۔ ان میں سے جو کچھ قرآن کے مطابق ہو اور موجودہ زمانے کے تقاضوں کو پورا کر سکے، اُسے بحالہٖ رہنے دیا جائے۔ جہاں ایسی صورت نہ ہو وہاں قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے نئے احکام مرتب کر لئے جائیں۔ اس ضابطہ کو مملکت میں اس طرح نافذ کر دیا جائے کہ اس کا اطلاق تمام ملتِ پاکستانیہ پر یکساں ہو۔ جہاں کوئی عملی دشواری پیش آئے، اس شق پر نظرِ ثانی کر لی جائے۔ اس طرح ثبات (قرآنی حدود) اور تغیر (جزئی احکام) کے امتزاج سے آگے بڑھتے چلے جائیں۔ یہی وہ اجتہاد ہے جو دین کا تقاضا اور ملت کی عملی ضرورت ہے۔ اس کے لئے شرطِ اوّل یہ ہے مختلف فرقے اس حقیقت کو تسلیم کریں کہ احکامِ شریعت میں حسبِ ضرورت تبدیلی کی جا سکتی ہے۔

(اضافہ ۱۹۷۸ء اس سے اگلے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں)

قرآنی قوانین

للّٰہ الحمد کہ پرویز صاحب کی تازہ ترین تصنیف ——— قرآنی قوانین ———
ملک میں بے حد مقبول ہو رہی ہے اور اس کی افادیت نکھر کر سامنے آ رہی ہے۔ اس سے نظر آتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو جائے گا۔ اگر آپ نے اسے ابھی تک حاصل نہیں کیا تو جلدی منگوا لیجئے۔

قیمت فی جلد (مجلد) بیس ۲۰/- روپے (علاوہ محصولڈاک)

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

اضافہ (۱۹۷۸ء)

یہ امر ایک گونہ موجبِ اطمینان ہے کہ اب زمانے کے تقاضے ان حضرات کو اپنے مؤقف پر نظرِ ثانی کرنے کے لئے مجبور کر رہے ہیں۔ (مثلاً) قدامت پرست طبقہ میں، فرقہ اہلِ حدیث اپنے مسلک میں بڑا متشدد واقعہ ہوا ہے اور زکوٰۃ کی جزئیات ان کے نزدیک ابدی طور پر ناقابلِ تغیر چلی آ رہی ہے۔ ۱۹۷۴ء کا ذکر ہے کہ اس فرقہ کے ترجمان، ماہنامہ محدّث (کی رجب۔شعبان ۱۳۹۴ھ) کی اشاعت میں ایک شذرہ شائع ہوا جس کی ابتدا اس طرح ہوتی تھی۔

ہمارے ایک عزیز دوست نے "زکوٰۃ اور عصری تقاضے" کے عنوان سے زکوٰۃ کے موضوع پر متعدد قسطوں میں تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ اس میں ایک جگہ فرمایا.....

ان کے یہ "عزیز دوست" مسلک اہلِ حدیث ہی کے متعلق ہیں جن کا مقالہ، ہفت روزہ، اہلِ حدیث لاہور کی اشاعت۔ بابت ۱۶ر اگست ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے:۔

خوشحال معاشرہ کا قیام اسلام کا بنیادی نظریہ ہے........ زکوٰۃ کی فرضیت بھی اسی نقطۂ نظر سے ہوئی ہے۔ تاہم جس معاشرہ اور ماحول میں اس عمل کو فرض کیا گیا ہے وہ آج کل کے ماحول اور معاشرہ سے قدرے مختلف تھا...... اس سلسلہ میں "قانونِ ضرورت" کو بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ شرعی قانون کی رُو سے زکوٰۃ چار اشیا پر فرض ہے۔

(۱) مویشی..... (۲) غلہ اور پھل۔ (۳) نقدی (سونا چاندی)۔ (۴) تجارت۔

پہلی تین مدّات تو بحالہٖ قائم ہیں۔ مگر جہاں تک مال کی تجارت کا تعلق ہے، اس کا میدان اب بہت وسیع ہو چکا ہے۔ لہٰذا اس معاملہ میں مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔ نصابِ زکوٰۃ بھی اسلام میں مقرر ہے لیکن اس معاملہ میں تمام علماء کا اتفاق ہے کہ یہ انفاق فی سبیل اللہ کی کم از کم مد ہے۔ زکوٰۃ کا یہ نظام جب رائج کیا گیا تو اس وقت طلب اور رسد کی ضرورت کے مطابق تھا۔ زکوٰۃ کا مقصد صرف یہ نہیں کہ مقررہ اموال میں سے معینہ مقدار ادا کر دی جائے۔ چاہے وہ معاشرتی ضروریات کا ایک فیصد ہی پورا کرے...... زکوٰۃ کو فقراء اور محتاج لوگوں کی تمام ضروریات کا کفیل ہونا چاہیئے۔ لہٰذا آجکل اس امر کی ضرورت ہے کہ "ضرورت" کا اندازہ لگا کر نظامِ زکوٰۃ کو از سرِ نو منظم کیا جائے۔

(ہفت روزہ "اہلحدیث" لاہور صـ۳ـ۔ ۱۶ر اگست ۱۹۷۴ء)

ماہنامہ محدّث کی طرف سے، اس پر تبصرہ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:۔

یہ فکرِ جدید طبقہ کی طرف سے وبا کی طرح پھیل رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اہلِ حدیث جنہوں نے بادِ مخالف کے تیز و تند جھونکوں میں ہمیشہ شمعِ سنت فروزاں رکھی وہ بھی اب ڈانواں ڈول ہونے لگے ہیں۔

(بحوالہ طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۱۹۷۶ء)

ایک قدم آگے بڑھئے۔ "رابطہ عالمِ اسلامی" سعودی عرب کی ایک ممتاز مذہبی تنظیم ہے۔ (واضح رہے کہ سعودی عرب

مسلکِ اہلِ حدیث کا سب سے زیادہ متشدد پیرو ہے)۔ اس رابطہ کے زیرِ اہتمام، جولائی ۱۹۷۸ء میں کراچی میں، پہلی اسلامی ایشیائی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں انہوں نے اپنے ترجمان، ماہنامہ "رابطہ عالمِ اسلامی" کا رجب ۱۳۹۸ء (مطابق جون ۱۹۷۸ء) کا شمارہ علماء میں تقسیم کیا۔ اس شمارہ میں، اس نکتہ پر بحث کرتے ہوئے کہ زکوٰۃ کے متعلق رسول اللہؐ کی متعین فرمودہ جزئیات میں تبدیلی ہو سکتی ہے یا نہیں، لکھا ہے:-

علی ان المقصود بالزکوٰۃ ان تسد حاجۃ المحتاجین و تفرج الازمات ۔ فان لم تنفرج الازمۃ فان وضع القدر المفروض لا یعفی من المسئولیۃ وعلی القادرین الاسہام وعلی الدولۃ ان تأخذ من القادرین ۔ لان رسول اللہ حدد مقدار الزکوٰۃ بحاجۃ عصرہ ولم یحدد القرآن مقادیرھا ۔ وباب الاجتہاد مفتوح ۔ (ص ۶۶)

زکوٰۃ کا مقصد یہ ہے کہ وہ حاجتمندوں کی ضروریات کو پورا کرے اور ان کی پریشانیوں کو دور کرے۔ اگر موجودہ شرح سے حاجتمندوں کی پریشانیاں دور نہیں ہوتیں تو پھر اس شرح سے زکوٰۃ ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا کرنے والے کی ذمہ داری ختم نہیں ہوتی۔ زکوٰۃ کا انتظام کرنے والوں اور حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ صاحبِ نصاب لوگوں سے زیادہ شرح سے زکوٰۃ وصول کریں، کیونکہ رسول اللہؐ نے جو شرح مقرر کی تھی وہ آپ کے زمانے کی ضروریات کے مطابق تھی۔ اور قرآن مجید نے اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔ اس کے لئے اس نے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔

ان نظائر سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان حضرات نے اس اصول کو تسلیم کر لیا ہے کہ شریعت کے احکام میں زمانے کے تقاضے کے مطابق تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ جس دن اس اصول کو پاکستان (یا کسی اور اسلامی مملکت) نے تسلیم اور اختیار کر لیا، وہ دن اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لئے بڑا مبارک اور مسعود ہو گا ——— خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔ اور جلد ایسا ہو کہ زمانہ برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔

والسلام

پرویز

(۰)